علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم

طلوعِ اسلام

ایک ملی اسلامی مجلہ

اپریل ۱۹۳۸

ایک روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوع اسلام

کراچی

دورِ ثانی

مرتب
محمد یونس

بدلِ اشتراک
سالانہ دس روپے
ششماہی چھ روپے

جلد ۱	قیمت فی پرچہ ایک روپیہ	نمبر ۴

فہرست مشمولات

۱۰ اپریل کی یاد میں	۱	قرآنی تعلیم (علامہ اسلم جیراجپوری)	۶۳
لمعات	از ۳ تا ۸ - بقیہ ۹۷	اقبال اکادمی	۶۹
مجاہدین کا کیمپ	۹	ترانۂ پاکستان	۸۳
حکومت کو یاددہانی	۱۶	پاکستانی اچھوت	۸۸
وراثت ارض کا ابدی قانون (جناب پرویز)	۱۷	طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی	۸۹
تقسیم ہند کا آئینی پہلو (۲)	۲۹	بقیہ لمعات	۹۷ تا ۱۰۰
خشم نگر	۵۳		

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی یاد میں

سرودِ رفتہ باز آید نیاید
نسیمے از حجاز آید نیاید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید نیاید

بانیٔ تصورِ پاکستان، مفکرِ اسلام، ترجمان القرآن

حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ

لمعات

بدل کے بھیس زمانہ میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

سابقہ اشاعت میں ہم نے "محاسبۂ نفس" کے زیرِ عنوان، ضمناً یہ بھی لکھا تھا کہ نیشنلسٹ مسلمان کس طرح خاموشی سے نظم و نسق حکومت میں دخیل ہو رہے ہیں اور اس طرح مملکتِ پاکستان کے لئے ایک مستقل خطرہ کا موجب بن رہے ہیں۔ یہ وہ طبقہ ہے جو زیرِ نقاب اپنے مشن کی تکمیل میں مصروف کار ہے۔ لیکن ان ہی کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ایک دوسری شکل میں پاکستان کی تخریب کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔ اس گروہ کا سرخیل، سرحدی گاندھی عبدالغفار خان ہے۔ یہ خان صاحب جب مجلس دستور ساز پاکستان کے اجلاس میں شمولیت کے لئے عازمِ کراچی ہونے والے تھے تو ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا کہ معلوم اب یہ مسلمانوں کے لئے کیا نئی مصیبت پیدا کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے یہاں پہنچ کر سب سے پہلے تو اسی "پٹھانستان" کا مطالبہ پیش کیا جسے ہندو کی اسلام دشمنی نے تقسیمِ ہند سے پہلے تشکیلِ پاکستان کی راہ میں ایک سنگِ گراں کی حیثیت اختیار کرنے کے لئے وضع کیا تھا اور جسے ریفرنڈم کے موقعہ پر مسلمانانِ سرحد میں تشتت و افتراق پیدا کرنے کے لئے بطور آلۂ حرب استعمال کیا تھا۔ اس وقت یہ آلۂ حرب جس قدر ناکام ثابت ہوا اس کے پیشِ نظر بھلا خیال تھا کہ سرحدی گاندھی صاحب اسے دوبارہ میدانِ جنگ میں نہیں لائیں گے۔ لیکن وہ اپنی بندوق میں جہاں ایک تازہ کارتوس لائے (جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا)، اس چلے ہوئے کارتوس کو بھی ساتھ اٹھا لائے کہ شاید کوئی سادہ لوح اس کا بھی شکار ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مطالبہ کو اسمبلی میں پیش کیا اور اس کے حق میں یہ دلیل فرمایا کہ:

ہم، تمام پٹھانوں کے لئے، پاکستان میں ایک خود مختار علاقہ چاہتے ہیں۔ میرا مطالبہ وہی ہے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ڈیورینڈ لائن سے مشرق کی طرف تمام پٹھان متحد ہو جائیں اور اس مقصد کے لئے ہم آپ کی امداد کے خواہاں ہیں۔

(ہندوستان ٹائمز۔ ۶)

یعنی ایک خود مختار ریاست کی تشکیل کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اس کا مقصد بتایا جاتا ہے پٹھانوں کا اتحاد! پھر تماشا یہ کہ اس اتحاد کو جس کی بنا خالص نسل پرستی پر استوار ہے، اسلام کا مطالبہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسلام بیچارا بھی دنیا میں کس قدر مظلوم ہے۔ جو الزام کسی کے جی میں آئے اس کے سر تھوپ دے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔

لیکن، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ کارتوس چلا ہوا تھا، اس لئے موثر ثابت نہ ہوا۔ لہٰذا اس کے بعد سرحدی گاندھی صاحب نے دوسری لبلبی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے لئے انہوں نے پہلے یوں زمین تیار کی۔

ہمیں یہاں خلفائے راشدین کے انداز پر حکومت قائم کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کے لئے قربانی کی ضرورت ہوگی۔ ہمیں پاکستان میں اس اقتصادی اور سیاسی مساوات کو قائم کرنا چاہیئے جس کا حکم قرآن دیتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں کوئی فرقہ وارانہ آرگنائزیشن نہ ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ پاکستان ایک آزاد مملکت ہو جس کا نظم و نسق عوام کے ہاتھوں میں ہو (اربابِ حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) تم لوگوں کو عوام کا خادم ہونا چاہیئے۔ پاکستان کس کا ہے؟ یہ ہمارا ہے۔ پاکستان ایک غریب ملک ہے۔ اس کا نظم و نسق امیرانہ ٹھاٹھ سے نہیں ہونا چاہیئے۔

وہی قرآن اور قرآنی حکومت کے دعاوی جسے ہر شخص اپنے اپنے مقاصد و مصالح کیلئے بیدریغ استعمال کر رہا ہے۔ وہی غریبوں کے مصائب و آلام کا ذکر جس سے ہر سرمایہ دار کا سینہ فگار دکھائی دے رہا ہے۔ وہی ابلہ فریبی کہ جس سے آج اشتراکیت کے نقاب میں ہر جگہ بے آئینی پھیلائی جا رہی ہے سرحدی

گاندھی صاحب نے یہ آواز اٹھائی اور اس پر (پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق) پرانے پرانے غداران ملت جو اس وقت تک نہ معلوم کن کونوں اور کھدروں میں منہ چھپائے پڑے تھے، باہر نکل آئے۔ اور لبیک لبیک کہتے ہوئے ایک جگہ اکٹھے ہو گئے اور "آل پاکستان پیپلز پارٹی" (جماعت جمہور) کے نام سے ایک جداگانہ پارٹی کی تشکیل کا اعلان فرما دیا جس کا مقصد

(۱) پاکستان کو ایک اشتراکی جمہوری مملکت بنانا۔ اور

(۲) اس میں ثقافتی اور لسانی حدود پر مختلف حصوں کو خود مختاری عطا کرنا ہے۔ یعنی وہی "پٹھانستان" کا مطالبہ (رشق ۲۷) اب اشتراکیت کی تائید سے سامنے لایا گیا ہے۔

دورِ حاضرہ میں اشتراکیت کو بھی عجیب و غریب حربے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ جو شرارت پسند کسی منظم ادارہ کے خلاف شورش پھیلانا چاہے اس کیلئے نہایت آسان ہے کہ وہ غریبوں اور مزدوروں کا غمگسار بن کر اسٹیج پر آ جائے۔ دولتمند طبقہ کو گالیاں دینا شروع کر دے اور عوام کے مصائب و مشکلات کو نہایت دردانگیز طریق سے بیان کر کے لوگوں کے .... جذبات کو مشتعل کر دے۔ وہ فوراً آئین شکنی پر تیار ہو جائیں گے اور فساد برپا کرنا شروع کر دیں گے۔ اور کبھی اتنا دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کریں گے کہ یہ امیروں اور سرمایہ داروں کے خلاف جذبات نفرت پھیلانے والا، خود کتنا بڑا سرمایہ دار ہے۔ ان ہی سرحدی گاندھی کو لیجئے جو اشتراکی انداز کی حکومت قائم کرنے کیلئے اس قدر مضطرب و بیتاب دکھائی دیرہے ہیں۔ یہ خود سرحد کے سب سے بڑے زمینداروں میں سے ہیں۔ ان سے پوچھئے کہ ان کی یہ سرمایہ داری کس اشتراکیت کی رو سے جائز ہے اور یہ جو اتنے وسیع و عریض رقبۂ زمین کے مالک بنے بیٹھے ہیں تو یہ کون سے قرآن کی رُو سے روا ہے۔ قرآن کی رو سے تو زمین کی انفرادی ملکیت جائز ہی نہیں۔ پہلے اپنے آپ کو اشتراکی اور قرآنی بنائیے اور پھر دوسروں کو اشتراکیت اور قرآن کی دعوت دیجئے۔ لیکن ان کا مقصد تو سوائے شورش پسندی اور فتنہ پردازی کے اور کچھ نہیں۔ ان کا مطمحِ نگاہ سوائے (خاکم بدہن) تخریبِ پاکستان

کے اور کوئی نہیں۔ انہوں نے ساری عمر ہندوؤں کا آلۂ کار بن کر پاکستان کی مخالفت کی۔ ملت کے مقاصد کو پائمال کرنے اور ان کے عزائم کو ناکام بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اُس وقت یہ لوگ نیشنلزم کے نقاب میں متاعِ ملت کی بربادی میں مصروف تھے اور پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش۔ آج پاکستان علیٰ رغم انف اعدا، محسوس و مشہود پیکر میں متشکل ہو گیا ہے تو ان کی آتشِ انتقام اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ لیکن اب بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر، کھلی ہوئی دشمنی کے بجائے پاکستان کی بہی خواہی اور ہمدردی کے منافقانہ لباس میں اپنے آقایانِ نعمت کا حق نمک ادا کر رہے ہیں۔ یہ ہیں پاکستان کے غم گسار اور ہوا خواہ ؎

ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو!

ہم حکومت کو ایک بار پھر متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ انہوں نے جمہوریت کا یہ مفہوم بالکل غلط سمجھا ہے کہ جن لوگوں کے متعلق یقینی طور پر معلوم ہے کہ وہ مملکت پاکستان کے کس قدر گہرے دشمن ہیں، انہیں پاکستان دوستی کے منافقانہ دعاوی کی آڑ میں اس قسم کی سازشوں کی اجازت دی جائے جس سے اس نوزائیدہ نظام کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں۔ ضرورت ہے کہ جو نیشنلسٹ عنصر نظم و نسق امور سلطنت میں کسی نہ کسی طرح دخیل ہو گیا ہے۔ یا جو کمیونسٹ عنصر (حقیقی یا مزعومہ) عوام کو آئین شکنی اور امن سوزی کے لئے بھڑکاتا ہے، اور مظاہرات اور اشتعال انگیز اسباب و ذرائع سے حکومت کی مشینری میں روڑے اٹکانے کی کوششیں کرتا ہے۔ آہنی گرفت سے اس کا مقابلہ کیا جائے تاکہ، قبل اس کے کہ اس کی جڑیں زمین گیر ہو جائیں، اس فتنہ کا استیصال ہو جائے۔ ابھی ہماری نو ترتیب یافتہ مملکت اس قسم کی سازشوں کی حریف نہیں ہو سکتی۔

لیکن ہمیں خدشہ ہے کہ ان حفاظتی تدابیر کے باوجود (اگر حکومت نے انہیں اختیار بھی کر لیا) یہ سازشیں بڑھیں گی اور پھیلیں گی۔ اس لئے نہیں کہ مخالفین کے دعاوی حق و صداقت پر مبنی ہیں (اگر یہ حق و صداقت پر مبنی ہوتے تو ہم ان کی مخالفت کیوں کرتے) اس لئے بھی نہیں کہ وہ اپنی

سازشوں کو کامیاب بنانے میں انتھک کوشش کریں گے۔ اس لئے بھی نہیں کہ ان کے استیصال کے لئے جس آہنی گرفت کی تجویز ہم نے پیش کی ہے وہ خلافِ مصلحت ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ تحریکیں کامیاب نہیں ہوں گی۔ یہ کامیاب ہوں گی اس لئے کہ ہمارے اربابِ اقتدار و حکومت نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ وہ آسمانِ سطوت و ثروت کی بلندیوں سے نیچے اتر کر کبھی بیچارے زمین والوں کی بھی بات سن لیں۔ ہم نے گذشتہ اشاعت میں بھی گزارش کیا تھا۔ اور اشاعت زیرِ نظر میں "طریق کوہکن" کے عنوان میں۔ اس گذارش کو پھر دہرانے کی جرأت کی ہے کہ حکومت اور ملت میں ایک خلا پیدا ہو چکا ہے جسے باہمی روابط سے پُر کرنے کی بڑی سخت اور بہت جلد ضرورت ہے۔ ملت حکومت کو اپنے میں سے نہیں سمجھ رہی۔ اس لئے کہ اربابِ حکومت نے کبھی انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ حکومت ملت کی ہے اور وہ ملت ہی کی خاطر نظم و نسق حکومت سرانجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی رفتار و گفتار میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ انہوں نے کبھی اس کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ وہ اتنا دریافت ہی کر لیں کہ غریبوں پر گذر کیا رہی ہے؛ انہیں کن مشکلات کا سامنا ہے؛ وہ کس طرح اپنے دن کاٹ رہے ہیں! یہ کبھی ان کی حالت جا کر دیکھیں تو انہیں معلوم ہو کہ اُن کے بچوں کو وہ کچھ نہیں ملتا جو اِن کے کتوں کو ملتا ہے۔ اُن کے اور اِن کے معیارِ زندگی میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ اُن کے سامانِ زیست اور اِن کے اثاثۂ حیات میں کوئی قدرِ مشترک ہی نہیں۔ اگر ہم عوام کے احساسات و جذبات اور امیال و عواطف کے مطالعہ کرنے میں غلطی نہیں کر رہے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ عوام کے دلوں سے اربابِ حکومت کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ اور حکومتیں صرف اعتماد کے زور پر چلا کرتی ہیں نہ کہ پولیس اور فوج کے بل بوتے پر۔

بملازمانِ سلطاں، خبرے دہم زرازے

کہ جہاں تواں گرفتن، بنوائے دل گدازے

تخریبی قوتیں، اس بُعد اور خلا سے فائدہ اٹھائیں گی جو قوم اور حکومت کے درمیان پیدا ہو چکا ہے اور جسے پُر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جا رہی۔ وہ اس بداعتمادی کو اپنے کام میں لا رہی

جو احترام و عقیدت کی بجائے عوام کے دلوں میں گھر کئے جا رہی ہے۔ وہ ان راہوں سے قصرِ پاکستان کی بنیادوں تک جا پہنچیگی اور پھر ان کا ازالہ نہ کوئی آہنی گرفت کر سکے گی نہ تلبیس شدید۔ ان کا علاج سب سے پہلے خود ہمارے ارباب حل و عقد کی زندگی کی تبدیلی میں مضمر ہے اور اس کے بعد شورش پسند، شر انگیز، تخریبی قوتوں کے استیصال میں۔ ان ہی دونوں کے مجموعہ کو قرآن و شمشیر کا ماحصل کہتے ہیں۔ اور

این دو قوت حافظ یکدیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

---

۱۰ مارچ کو مدراس میں مسلم لیگ کی ہندوستانی شاخ کا جلسہ ہوا جس میں ۱۲۹ اراکین میں سے صرف ۲۳ شریک ہوئے۔ صرف اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں آج کل بچارے مسلمانوں پر کیا گذر رہی ہے۔ لیگ مسلمانوں کی محبوب ترین جماعت تھی۔ لیکن وہاں کی حکومت مسلمانوں کے خلاف جس انتقامی جذبہ سے کام لے رہی ہے اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمان لیگ کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار تک بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے گذشتہ اشاعت میں لکھا تھا کہ ہندوستان میں راشٹریہ سیوک سنگھ اور مہا سبھا کے خلاف جو پکڑ دھکڑ شروع ہوئی ہے وہ محض دکھاوے کی ہے اور اس سے مقصد فقط اس قدر ہے کہ اس آڑ میں مسلم لیگ اور اس سے متعلقہ اداروں کو تخویف و ترہیب سے کچل ڈالا جائے۔ اس کی تائید اب خود وہاں سے ہو گئی ہے۔ چنانچہ ٹائمز آف انڈیا، اپنی ۱۰ مارچ کی اشاعت کے ثانوی مقالہ افتتاحیہ میں لکھا ہے کہ:

> جس سختی سے مرکزی اور صوبوں کی حکومتوں نے "ہندو فرقہ داری" کے خلاف کارروائی کی ہے اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ کا ایک طبقہ یہی مناسب سمجھتا کہ اب ہندوستان میں مسلم لیگ کو ختم کر کے کانگریس کی قومیت کو تقویت پہنچائی جائے...... ہندوستان

(بقیہ لمعات صفحہ ۹ پہ ملاحظہ)

مجاہدین کا کیمپ

(وہ دنیا جہاں ایمان عمل میں متشکل ہوتے ہیں)

محاذ کشمیر کے سلسلہ میں، شمال مغربی سلسلۂ کوہ سے آنے والے فاتحین، رضاکاران اور مجاہدین کے متعلق میں اکثر قصے کہانیاں سنتا آرہا تھا جن کی وجہ سے ان عجیب وغریب لوگوں سے ملنے کا شوق دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن ان آہنی مجاہدین کے مسکن کی تلاش اور پھر اس تک رسائی، جوئے شیر سے کم نہ تھا۔ بارے اس باب میں میری مساعی کامیاب ہو گئیں اور بالآخر وہ دن آگیا کہ میں ان کے کیمپ کے بیرونی حدود کے قریب جا پہنچا۔ وہاں پہنچتے ہی درشت پشتو کے ان الفاظ نے میرا استقبال کیا۔

کون؟ جہاں ہو وہیں رک جاؤ!

اور اس آواز کے ساتھ ہی ایک آہنی پیکر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ایک دیوہیکل جوان جس کی بندوق کی نالی کا منہ عین میرے دل پر تھا۔

میں اپنی جگہ بے حس وحرکت کھڑا تھا اور میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ سنتری آگے بڑھا اور اپنی فولادی انگلیوں سے میرے سینہ کو ٹھونکتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔

دوست یا دشمن؟

میرے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر تیز ہوگئی اور میں بھرائی ہوئی آواز سے بمشکل اتنا کہہ سکا۔

دوست نہیں ملک بھائی!

تم یہاں کیوں آئے ہو؟ یہ دوسرا سوال تھا جو مجھ سے کیا گیا۔

"سالار اعلیٰ سے ملنے" اُسے ایک خط دیتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

وہ گرج کر بولا - ناک کی سیدھ چلے جاؤ۔ اگر تم نے اِدھر اُدھر دیکھا تو وہیں ڈھیر کر دیئے جاؤ گے

میں بمشکل پچاس قدم آگے بڑھا ہونگا کہ تنومند، قوی ہیکل، تند خو، بندوقچیوں کا ایک دستہ میرے سامنے آیا۔ میں ابھی اپنا مطلب بھی پوری طرح بیان نہ کرنے پایا تھا کہ ایک شخص نے آگے بڑھ کر ایک بڑی سی ٹوپی سے میرے سر اور چہرے کو ڈھانپ دیا۔ اس کے بعد میری تلاشی لی گئی اور پھر مجھے اٹھا کر اتنے چکر دیئے کہ میرے حواس گم ہو گئے۔ اس کے بعد مجھے پہاڑیوں کے اوپر اور وادیوں کے اندر گھماتے گھماتے ایک سخت سے قطعۂ زمین پر لا کر ڈال دیا۔ اور میری ٹوپی اتار دی گئی۔ میری آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے گرد وپیش۔ سرو قد، عظیم الجثہ، زندگی کے جوش اور ولولے سے بھرے ہوئے نوجوان، پیرانہ سال، آفریدیوں، مہمندوں وزیریوں اور محسودوں کا ایک بپھرا ہوا سیلاب متلاطم ہے۔ تمام کے تمام خنجروں، چاقوؤں پستولوں، اور رائفلوں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ تند و تیز اور مہیب و خطرناک ہتھیاروں سے مسلح - ان کی گفتگو۔ آنے والی جنگ اور جنگ کی خوں ریزی، انتقام اور کامرانی۔ کارہائے نمایاں، اور فتوحاتِ درخشاں۔ کی یاد اور ضائع شدہ مواقع کی بازیابی کی تمناؤں پر مشتمل تھی۔ باتیں ہو رہی تھیں اور مجاہدین قطار در قطار، آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ وہ تمام سیدان انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بن گیا جو ادنیٰ سے اشارہ پر حدود، ساحل توڑ کر، ساری دنیا پر چھا جانے کے لئے مضطرب بیتاب نظر آتا تھا۔

اتنے میں دور سے بگل کی آواز آئی جس کے سنتے ہی یہ تمام پُر شور سمندر، تاروں بھرے آسمان کی سی خاموشی میں تبدیل ہو گیا۔ اب وہ مضطرب و بے قرار، پر جوش و خروش انسان نہیں، پتھر کے بے حس و حرکت مجسمے نظر آتے تھے۔ ساکت و صامت یہ سب کے سب، قطار در قطار ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ اتنے میں کھانا آ گیا۔ ایک موٹی سی روٹی۔ بھنے ہوئے گوشت کا ایک تکا اور شوربے کا پیالہ۔ بس یہ تھا ان کا الوداعی کھانا۔ کھانا کھا چکے تو سب کے سب اٹھ

کے حضور، نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ وہ آہنی ... کے متعلق ... پھر نہیں ہو سکتا تھا

سامنے جھکیں گی، زمیں بوس تھیں۔ نماز سے فارغ ہوئے تو پھر بگل کی آواز
نکل گئی۔ اب یہ سب کے سب خاموش کھڑے تھے۔ رائفلیں شانوں سے لٹکی
نوسوں کی پیٹیوں سے ڈھکے ہوئے۔ عزم و استقامت کے یہ آہنی پیکر
۔

آواز مدھم پڑی تو ہر طرف سکوت تھا۔ کامل سکوت — جب ایک دراز قامت
باب خاتون کی آواز نے توڑا جس میں مردانہ شکوہ و جلال بھرا ہوا تھا — یہ
— ماؤں بہنوں اور بچیوں — کے ایک اجتماع عظیم میں کھڑی تھی، جو اپنے
باپ، خاوند اور بھائیوں — کو الوداع کہنے کے لئے جمع ہوئی تھیں۔
ون نے ان مجاہدین کو مخاطب کرکے کہا۔

تم جا رہے ہو، لیکن جانے سے پہلے میری بات سنتے جاؤ
میں تمہارے لئے ایک پیغام لائی ہوں — یہ پیغام ہر ماں
ہر بیوی، ہر بہن اور ہر بیٹی کی طرف سے ہے۔
ہونٹوں کی سرخی اور رخسار کا غازہ عورتوں کی زینت ہے لیکن
مردوں کے ہاتھ کی زینت، دشمن کا رنگین لہو ہے۔
اگر تم فاتح و منصور واپس آئے تو ہمارے دلوں پر حکومت کرو گے۔
اگر تم میدانِ جہاد میں شہید ہو گئے تو ہم اپنے آنسوؤں سے تمہاری
یاد منائیں گی۔
لیکن اگر تم دشمن کو پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے تو یاد رکھو۔ تم ہماری
لاشوں کو روند کر ہی گھروں میں داخل ہو سکو گے۔

سن لیا —— اچھا خدا حافظ —— جاؤ!

کہ دنیا میں کسی
فضا کو چیرتی ہو
ہوئیں سینے
سامنے کھڑے
بگل کی
سن رسیدہ عفت
خاتون، مستورات
مردوں — لیے
اس خا

اس پیغام کے بعد، وہ خاتونِ محترم، معہ تمام بچیوں اور عورتوں کے، چٹانوں کے پیچھے اوجھل ہوگئی لیکن سننے والوں میں سے کسی نے ایک لفظ بھی جواب میں نہ کہا۔ جواب دیا تو ان کی شعلہ بار رائفلوں کے دہانوں نے جن کی کڑکتی ہوئی بجلیوں نے ساری فضا کو اس حقیقت پر گواہ بنا لیا کہ سمعنا و اطعنا۔ ہم نے سن لیا۔ خدا نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ وہ الفاظ میں جواب دینا نہیں جانتے تھے۔ صرف اعمال و کردار سے جواب دینا جانتے تھے۔ موت ان کے لئے کسی ڈر کا سامان اپنے اندر نہیں رکھتی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اسے کس طرح جھانسا دیا جا سکتا ہے۔

مجاہدین گروہوں میں بٹ گئے اور دیوانہ وار رقص کرنے لگ گئے ـــ موت کی تمنا میں رقص ـــ رقص کرتے اور گاتے۔ نعرے بلند کرتے اور حلف اٹھاتے۔ حلف اٹھاتے اور چکر لگاتے اور اس طرح موت کو پیچھے دھکیلتے، زندگی اور اس کی گرم جوشیوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ نقارہ کی آواز نے اس جوش و رقص کو پھر سکوت و خاموشی میں تبدیل کر دیا۔

"اے موت کے پیغامبرو!" ایک کرخت آواز نے نہایت تحکمانہ انداز سے کہا۔

جاؤ ـــ اور جہاں جاؤ موت کا پیغام اپنے ساتھ لیتے جاؤ۔

موت کا پیغام ان کے لئے جن کی ستم رانیوں نے بے گناہوں کا خون بہایا ہے۔

دخترانِ اسلام کی عصمت دری کی ہے

اللہ کی مساجد کی بے حرمتی ہوئی ہے۔

کیا اب بھی تم دینِ خداوندی کی عزت بچانے کے لئے تلوار نہیں اٹھاؤ گے؟

تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ تمہاری راہ پٹیل کی ہے یا محمدؐ کی۔

کیا تم نے اپنی راہ پہلے ہی منتخب نہیں کر رکھی؟

تمہاری ماؤں نے تمہیں اسی دن کے لئے جنا تھا۔

خدا کی قسم! جس خدا نے تمہارے ساتھ اپنے وعدوں میں کبھی خیانت نہیں کی۔ اگر تم نے

اس کے ساتھ خیانت کی تو تمہیں دنیا میں سر چھپانے کو کہیں جگہ نہ مل سکے گی۔

جاؤ ـــ اور دیکھو کہ دشمن کی تعداد یا اس کی قوت تمہیں مرعوب نہ کر دے۔ اس لئے کہ تمام قوتوں کی مالک صرف خدا کی ذات ہے۔

خدائے رحمان کی بشارات دینے والے فرشتے، تمہارے قلب و دماغ اور دست و بازوؤں کو صراط مستقیم پر رکھیں۔

دیکھنا ـــ عورتوں اور بچوں پر کبھی ہاتھ نہ اٹھانا۔ اپاہجوں اور نہتوں کو کبھی نہ چھیڑنا لیکن کسی ڈوگرہ اور سکھ کو کبھی نہ چھوڑنا ـــ ان سے شمشیر آتش کی زبان میں گفتگو کرنا کہ وہ اس کے سوا کوئی دوسری زبان سمجھ ہی نہیں سکتے۔

جاؤ میرے بچو! اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہو۔

اللہ اکبر!

اس کے ساتھ ہی ارد گرد کی پہاڑیاں "اللہ اکبر" کے نعروں سے گونج اٹھیں اور گولیوں کی آواز نے فضا کو مرتعش کر دیا۔ اور یہ کاروان عمل و حرکت پہاڑ کے دامن میں اترتا چلا گیا۔

میں اس کیفیت سے سرشار، اپنے خیالات میں مستغرق کھڑا تھا جو ایک دوستانہ ہاتھ نے میرے کندھے کو جنبش دی اور ایک رافت آمیز آواز نے مجھ سے پوچھا ـــ کیوں بھائی آپ کا جی گھبر گیا؟

میں اپنے گہرے خیالات سے یک لخت چونکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے سامنے ایک سن رسیدہ، بارعب، واجب الاحترام شخصیت موجود ہے جس کے نورانی چہرے پر مشفقانہ تبسم رقص کناں ہے۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا ـــ جناب سالار اعلیٰ سے تو ابھی تک مجھے شرف ملاقات حاصل ہی نہیں ہوا"

"سالار اعلیٰ میں ہی ہوں" ـــ مجھے جواب ملا۔

میں فرط تعظیم سے جھک گیا۔ پھر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو ایک دو سوال پوچھ لوں!

جتنے جی چاہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہونگا کہ آپ جتنے کم سوال پوچھیں گے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ کیونکہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہم سب اس وقت میدانِ کارزار میں ہیں۔ ہم سب ۔ گہواروں میں ہمارے بچے تک بھی۔ بلکہ قبروں میں ہمارے مردے تک بھی۔ ہم سب کے سب میدان کارزار میں ہیں۔ نازک ترین گھڑی ہمارے سروں پر آ پہنچی ہے۔ اب اس قدر وقت ہے نہیں کہ اسے باتوں میں ضائع کیا جا سکے۔ اسلام خطرے میں ہے۔ اس وقت محض کشمیر کا سوال نہیں بلکہ اس وادی میں جو معرکہ درپیش ہے اُس کے ساتھ محمدؐ پاک کی عزت کا سوال بھی وابستہ ہے۔

محمدؐ پاک کی عزت کا سوال:

ہماری منزل کٹھن ہے اور راہ دشوار۔ لیکن منزل بالکل واضح ہے۔ دشمن ہماری پہاڑیوں اور ہمارے گھروں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ ہمیں بموں اور سنگینوں کے زور پر اطاعت کے لیئے مجبور کر دے اور برطانیہ اور روس کی جنگ میں ہمیں روس کی توپوں کا چارہ بنایا جائے۔ لیکن قسم ہے خدائے پاک کی۔ ہم انگریز اور ہندو ملوکیت کے بھاڑے کے ٹٹو بن کر کسی ملک یا کسی نظریہ کے خلاف جنگ نہیں کریں گے۔

ہم رسولِ پاکؐ کے سوائے کسی اور کی اطاعت کو نہیں جانتے۔ ہم اسی کے دامن سے وابستہ ہیں اور اس کے دامن کی حفاظت کے لیئے اپنی جان تک قربان کر دیں گے۔ انگریز نے گذشتہ سو برس میں ہمارے خلاف ۲۷ چڑھائیاں کیں لیکن اس کے باوجود ہماری روح کو محکوم نہ کر سکا۔ اب یہ ۲۷ ویں اور آخری یورش ہندوؤں کے زیر سرپرستی کی جا رہی ہے۔ اس کا انجام بھی دشمن کے لیئے ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لیکن اس کے لیئے ہمیں اپنی پوری

پوری قوت صرف کرنی ہو گی۔ اور واللہ ہم ایسا کرنے میں یقیناً کامیاب ہوں گے ہم نے اپنے دس لاکھ بہترین افراد کی جمعیت تیار کر رکھی ہے۔ ہمارے تمام مرد میدان جنگ میں ہوں گے اور ہماری عورتیں ہمارے کھیتوں کو کاشت کریں گی۔ مویشیوں کی دیکھ بھال کریں گی اور رسد کا ذخیرہ جمع کریں گی۔ وہ ہمارے اسلحہ سازی کے کارخانوں کو چلاتی رہیں گی اور "محاذ خانہ" امور قبائلی زندگی کو رواں رکھیں گی۔ اور ضرورت پڑنے پر وہ خود بھی میدان جنگ میں آجانے سے دریغ نہ کریں گی اور اس وقت تک لڑتی رہیں گی جب تک ہمارا ملک دشمن کے ناپاک قدموں سے پاک نہیں ہو جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ہم ختم ہو جائیں گے۔

اچھا خدا حافظ ــــ دوست ــــ خدا حافظ

یہ کہا اور مجاہدین کا یہ دنیا جہان سے نرالا سردار، چلا گیا۔ پھر چاروں طرف فضا پر خاموشی چھا گئی۔ اور میں پھر وادیٔ حیرت میں کھو گیا۔ میرا قلب، مضطرب و بے قرار اور میری روح، دردمند و غم آگیں تھی۔

"جب کفر و اسلام کا معرکہ اس طرح برپا ہو، کیا اس وقت مجھے زیب دیتا ہے کہ میں گھر پر بیٹھا رہوں"

یہ تھا وہ سوال جو بار بار میرے سامنے آرہا تھا۔

اور اس کا جواب یہ تھا کہ اس کے بعد میں پونچھ میں تھا۔

* * *

[مذکورہ صدر روئداد، ۹ر مارچ کے "ڈان" میں، ایک صاحب، اے۔ جی نفیس الرحمان کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔ جسے ہم اپنے الفاظ میں، طلوع اسلام کے صفحات پر شائع کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔ جناب نفیس الرحمن سے ہم ذاتی طور پر واقف

نہیں۔ نہ ہی ہمیں ان کا پتہ معلوم ہو سکا ہے۔ بہرحال وہ جہاں بھی ہوں، اُن تک ہمارا اسلام پہنچے اور ہمارے دل دردآگیں کی مخلص دعائیں کہ اللہ ان کا اور ان کے رفقائے عمل اور جملہ مجاہدین کا حافظ و ناصر ہو اور وہ سب کامیاب و کامراں فاتح و منصور واپس لوٹیں اور اس طرح انہیں دنیا اور آخرت کی سرفرازیاں حاصل ہوں

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

مدیر طلوع اسلام]

۲۱ر اپریل کو

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کا یوم وفات ہے۔ ہم نے سابقہ اشاعت میں ارباب حکومت کی توجہ ان کی اس فروگذاشت کی طرف منعطف کرائی تھی جو ان سے بانیٔ تصور پاکستان کی یاد نہ منانے کے سلسلہ میں ہوئی ہے۔ ہم نے گذارش کیا تھا کہ

(۱) ۲۱ر اپریل کو عام تعطیل کی جائے۔

(۲) اور اس تقریب کو منانے کیلئے حکومت کی طرف سے خاص طور پر اہتمام کیا جائے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس وقت تک آثار سے کہیں پتہ نہیں چلا کہ حکومت نے اپنی اس فروگذاشت کا احساس کیا ہے اور انہیں اس کی تلافی کی فکر ہوئی ہے۔

لیکن چونکہ ۲۱ر اپریل میں ابھی وقت باقی ہے اس لئے ہم نے ابھی تک امید نہیں توڑی۔ خدا کرے پاکستان کی حکومت اس درجہ احسان ناشناس ثابت نہ ہو، کہ اپنے اس عظیم القدر محسن کی یاد تک نہ منائے۔

قوم بیتابی سے حکومت کے اقدام کی منتظر ہے۔

وراثت ارض کا ابدی قانون

پرویز

نظام کائنات ایک معینہ قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرہ خاک سے لے کر بڑے سے بڑے کرہ سماوی تک ہر شے رزدانی تقدیر ہے۔ آفتاب جہانتاب ایک مقررہ قاعدہ کے مطابق ہر صبح دریچۂ مشرق سے جھانکتا ہے اور ایک متعینہ شاہراہ پر چل کر ہر شام حجلۂ مغرب میں روپوش ہو جاتا ہے۔ اس کے دوران سفر میں ہر شے جس میں زندگی کی صلاحیت ہوتی ہے، اس کے نور و حرارت سے اپنے سینے کو بھرپور کر لیتی ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (۳۶/۳۸) چاند ایک خاص قاعدہ کے مطابق، ایک خوطہ خور کشتی سیمیں کی طرح دریائے نیل سے ابھرتا ہے اور ایک خاص نظام کے تابع پھیلتا اور سمٹتا، پھر کسی کی تلاش میں گم ہو جاتا ہے۔ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ (۳۶/۳۹) جب خزاں کی دست درازیاں صحن گلستاں سے شگفتگی و شادابی کے تمام آثار و مظاہر کو، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے متاع حیات کی طرح ختم کر دیتی ہیں تو فطرت کے ایک معینہ قاعدے کے مطابق، نسیم بہار، مسرتوں اور شادمانیوں کی ایک رنگین و عطر آگیں دنیا اپنے جلو میں لئے آتی ہے، اور زمین کے حسرت زدہ، غم آلود چہرے کو پھر تبسم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتی ہے۔ وَكَذَٰلِكَ اللَّهُ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۳۶/۳۳) وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ (۳۶/۳۴)

پھر جس طرح یہ قوانین و ضوابط خارجی دنیا میں جاری و ساری ہیں اسی طرح انسان کی

داخلی دنیا میں بھی ان کی حکمرانی ہے۔ اور جس طرح انسان کی انفرادی زندگی کی جوئے رواں ان ہی سواحل میں محصور ہے اسی طرح اس کی حیاتِ اجتماعیہ کا یم بیکراں بھی ان ہی حدود و ثغور میں مقید۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ میں سب سے اہم شعبہ نظامِ حکومت اور آئینِ مملکت ہے۔ جسے قرآن "وراثتِ ارض" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ حکومت کیسے ملتی ہے اور کس طرح ملتی رہتی ہے۔ اور پھر کس سے چھنتی ہے اور کیوں چھنتی ہے؟ اس کے لئے بھی خدا کا ایک ابدی قانون متعین ہے اور وہ قانون، قرآن کے ان الفاظ میں مشہود ہے جو سورۂ انبیاء میں یوں مرقوم ہیں۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝ (۲۱: ۱۰۵-۱۰۶)

اور ہم نے تورات کے بعد زبور میں (بھی) اس حقیقت کو لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت ہمارے صالح بندوں کے لئے مقدر ہے (اس عظیم الشان قانونِ خداوندی میں) عبودیت اختیار کرنے والی قوم کے لئے ایک (عظیم القدر بصیرت افروز حقیقت کشا) پیغام ہے۔

امانتِ حکومت و مملکت کی تفویض اور متاعِ جہانداری و جہانبانی کی وراثت کے متعلق یہ وہ قانونِ ابدی اور اصولِ سرمدی ہے جس کا نوشتۂ خداوندی کی حیثیت سے اعلان کیا گیا ہے اور اس میں قوموں کے عروج و زوال اور امتوں کے استخلاف و استبدال کے متعلق ایک ایسے بنیادی معیار کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ہر صاحبِ بصیرت کے لئے پیغامِ عظیم اور بلاغِ مبین مضمر ہے۔ یہ بنیادی اصول کیا ہے؟ بس یہی کہ وراثتِ ارض کے لئے صلاحیت (یا صالحیت) شرط ہے۔ یعنی وہی قانون جو عالمِ آفاق میں بقاء للاصلح کے محکم اصول کی حیثیت سے جاری و ساری ہے۔

"صلاح" دیکھنے کو تو چار حروف کا ایک مختصر سا لفظ ہے لیکن اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایسا ہمہ گیر ہے کہ اس میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ کر آگئے ہیں۔ صالح کے معنی صحیح و سالم، تندرست، توانا، مستوی الجسم اور متناسب الاعضاء، زندگی کی تمام صلاحیتوں کو

لئے ہوئے ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں ہے کہ جنین کی پیدائش سے پہلے، میاں بیوی دونوں خدا سے دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ لَئِنْ آتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ (خدایا! ہمیں صحیح وسالم، تندرست و توانا بچہ عطا کر دے تاکہ ہم تیرے شکر گزار بنیں۔ ۷/۱۸۹) فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا (لیکن جب اللہ انہیں تندرست و توانا بچہ عنایت کر دیتا ہے تو اس بارے میں اللہ کے ساتھ اوروں کو بھی شریک بنانے لگ جاتے ہیں) اس جگہ صحیح و سالم اور تندرست و توانا بچہ کے لئے صَالِحًا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اس کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ سورۂ انبیاء میں ہے کہ حضرت زکریا کے ہاں اولاد نہ تھی۔ انہوں نے اس کے لئے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے ان کی رفیقۂ حیات کو جو عقیم تھیں، اولاد کے قابل بنا دیا۔ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ (۲۱/۹۰) لہذا اصلاح کے معنی اُن قابلیتوں اور استعدادوں کا پیدا ہونا ہے جن سے عمدہ نتائج مرتب ہوں۔ ان ہی معنوں میں یہ لفظ سورۂ النور میں استعمال ہوا ہے جہاں فرمایا کہ تمہارے غلاموں اور لونڈیوں میں سے (جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں میں موجود تھے) جو نکاح کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ (وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ ۲۴/۳۲) ان کے نکاح کر دو۔

ان آیات سے صلاح و صالح کے معانی ہمارے سامنے آ گئے جن سے واضح ہو گیا کہ اس قانونِ سرمدی کی رو سے جو ہمارے موضوع کا محور اور اس زندگی بخش داستان کا زیب عنوان ہے، زمین کی وراثت (حکومت و مملکت) کے مستحق وہی ہوں گے جو اس کی صلاحیت و قابلیت رکھتے ہوں۔ جن میں زندگی اور اس کی توانائیاں تڑپ رہی ہوں۔ جن کے سینوں میں دم، جگر میں خون، بازوؤں میں قوت، پاؤں میں استقامت، ذہنوں میں جلا، نگاہوں میں روشنی، ارادوں میں بلندی اور عزائم میں پختگی ہو جو دنیا میں حکومت و سطوت کی زندگی بسر کرنے کی تمنا رکھتے ہوں۔ اور پھر اس تمنا کی تکمیل اور اس آرزو کے حصول کیلئے ایسی قوت فراہم کریں کہ جو قوم ان کے عزائم کی راہ میں مزاحم ہو اسے خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں۔ دنیا میں جس کے پاس قوت نہیں اس کا کوئی دعویٰ بھی سچا نہیں۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

جو اپنی قوتِ بازو سے زندہ رہنے کا حق قائم نہیں کرتا اسے کوئی زندہ رہنے نہیں دیتا

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

وہ قانون جس کے پیچھے قوت نافذہ نہ ہو، وعظ اور اپدیش بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے اس قانون کے ساتھ، جسے دنیا میں دین کی حیثیت سے مستمر و متمکن رہنا مقصود ہو، فولاد کی شمشیر جگر دار کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وہ ضوابط قانون ہیں جن کے متعلق فرمایا کہ ہم نے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (۵۷/۲۵)، ہم نے ضوابط دین اور میزان عدل کے ساتھ فولاد بھی نازل کیا جس میں بڑی شدت کی سختی ہوتی ہے لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۵۷/۲۵) تاکہ لوگ جادۂ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند

کائناتِ زندگی را محور اند

یہی وہ قوت ہے جس کے متعلق فرمایا کہ:-

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ

بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸/۶۰)

جس قدر قوت کے ساز و سامان اور گھوڑوں کے پہرے کے پرے باندھ رکھنے کی تم میں استطاعت ہو وہ تم اللہ اور اپنے دشمن کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رکھو۔

قوت اور رباط الخیل کی جامعیت میں تمام سامان و آلاتِ حرب و ضرب، ساز و یراقِ جنگ، جدل، اور وسائل و اسباب مدافعت و محاربت شامل ہیں۔ زمانہ کے مقتضیات اور احوال و ظروف کے تبدل و تغیر سے ان اسباب و وسائل کی نوعیتوں میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن قوت کی وہ روح جو زندگی کی اصل ہے، ہر جگہ بدستور قائم رہے گی۔ گوپیے کے پتھر سے لے کر ایٹم بم کے گولے تک، ایک ہی روح کے مظاہر، ایک ہی اصل کی شاخیں۔ ایک ہی جان کے پیکر، اور ایک ہی

نما کی نیام ہیں۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ان پیکروں کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ جس قوت کی نوعیتیں وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتیں، وہ قوت اصافہ زندگی میں اسی طرح پیچھے رہ جاتی ہے جس طرح فلک پیما طیارہ کے مقابلہ میں تانبہ جی کی بہلی"۔

ہاں تو! دنیا میں زندہ رہی رہتا ہے جس میں زندہ رہنے کی استعداد ہو۔ آگے وہی بڑھتا ہے جس میں آگے بڑھنے کی استطاعت ہو۔ لہٰذا حکومت و مملکت اسی کی تقدیر میں ہوتی ہے۔ جس میں جہانبانی و جہانداری کی صلاحیتیں اور خسروی اور سریر آرائی کی قابلیتیں ہوں۔ اِنَّ فِی ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۔

یہاں تک صالحیت کا صرف ایک گوشہ ہمارے سامنے آیا ہے جس کا نام مادی قوت (Physical Power) ہے۔ لیکن قرآن کی رو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی۔ اس میں تو کافر و مومن کی کوئی تمیز نہیں۔ حزب اللہ اور حزب الشیطان کی کچھ تفریق نہیں۔ جو بھی مادی قوت حاصل کر لے، وہ غلبہ و استیلاء حاصل کر سکتا ہے، اور اس طرح صاحب حکومت و سلطنت بن سکتا ہے۔ آج دنیا میں جدھر نگاہ ڈالئے، ان ہی مادی قوتوں کا باہمی مقابلہ نظر آئے گا۔ جس کے پاس قوت اور اس سے حاصل کردہ سامان و ذرائع زیادہ ہیں، وہی سب سے بڑی سلطنت و حکومت کا مالک ہے اور یہ صرف آج ہی پر کیا موقوف ہے۔ دنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے، ہر صفحہ پر یہی حقیقت فولاد کے ابھرے ہوئے الفاظ میں آپ کے سامنے آئے گی۔

لیکن، جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے، قرآن کی رو سے فقط مادی قوت سے صالحیت کی شرط پوری نہیں ہو جاتی اور صرف اس کے زور پر قائم کردہ غلبہ و استیلاء اور تسلط و تمکن سے اصلاح نہیں پیدا ہوتی۔ اس نے بتایا ہے کہ اصلاح و فساد، دو الگ الگ نتائج ہیں، جو ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ جو نظام سلطنت فقط مادی قوتوں کے استیلاء پر قائم

ہوتا ہے اس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔ سورۂ شعراء میں دیکھئے اس حقیقت کو کس قدر واضح طور پر بے نقاب کیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا کہ۔

وَلَا تُطِيعُوٓا أَمْرَ ٱلْمُسْرِفِينَ ۝ ٱلَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۶/۱۵۱-۱۵۲)

حدود فراموش سرکش قوتوں کے نظام کی اطاعت مت کرو۔ اس لئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اصلاح نہیں کرتے۔

سورۂ نمل میں اسی ضمن (قصۂ حضرت صالحؑ) میں ارشاد ہے کہ

وَكَانَ فِى ٱلْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ (۲۷/۴۸)

اور اس شہر میں تو اکابر ارکان سلطنت تھے جو ملک میں فساد برپا کر رہے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

یہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق قرآن کی ابتدائی آیات میں کہدیا گیا ہے کہ

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِى ٱلْأَرْضِ قَالُوٓا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ۝ (۲/۱۱)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں!

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے قرآن نے ان چند الفاظ میں سمیٹ کر رکھدیا ہے۔ عہد قدیم کے نماردہ و فراعنہ سے لیکر عصر حاضر کے "ہٹلران وچرچلان" میں سے کسی سے پوچھئے۔ ہر پیکر فساد و استبداد یہی کہے گا کہ ہماری غرض اصلاح ہے، مفسدین تو دوسرے ہیں۔ گذشتہ جنگ عمومی میں ہر فریق متخاصم کی زبان پر یہی تھا کہ ہم حق و صداقت اور عدل و انصاف کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اور اب بھی مغربی بساط سیاست کے ہر مہرہ باز کا یہی اعلان ہے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ لیکن قرآن کی رو سے ہر وہ نظام جو ذاتی اغراض و مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے قوت کے زور پر قائم کیا جاتا ہے۔ باطل کا نظام ہے جس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں۔ اصلاح صرف اس نظام کا نتیجہ ہے جس میں قوت کا استعمال آئین خداوندی کی تنفیذ و ترویج کے لئے ہوتا ہے۔ اس نظام کا فطری نتیجہ

عدل ہوتا ہے اور عدل سے مفہوم ہے ایسی فضا جس میں ہر شخص کی فطری صلاحیتوں کے ابھرنے، نشو و نما پانے اور تکمیل تک پہنچنے کے لئے یکساں مواقع میسر ہوں۔ شرفِ انسانیت اسی نظام میں، ارتقائی منازل طے کر کے اپنی انتہا تک پہنچ سکتا ہے

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبی است

اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ محکومیت و اطاعت صرف احکام خداوندی کی ہوگی اور جس جماعت کے ہاتھوں ان احکام کی تنفیذ ہوگی وہ اپنے ہر قول و فعل کے لئے اپنے خدا کے سامنے ذمہ دار ہوگی۔ اس ایمان کی بنیاد پر جو عمارت قائم ہوگی اس کا نام عمل صالح ہے اور ان دونوں کا نتیجہ استخلاف فی الارض۔ یہی وہ استخلاف (وراثتِ ارض) ہے جس کے لئے صالحیت کی شرط ہے۔ یا یوں کہیے کہ جب اور جہاں اس قسم کی صالحیت پیدا ہوئی، وراثتِ ارض اس کا فطری نتیجہ ہوئی۔ اسی کا نام "اللہ کا وعدہ" ہے جس کا ذکر سورۂ نور کی ان درخشندہ آیات میں کیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۲۴/۵۵)

اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ تم میں سے جو بھی ایمان لائیں گے اور صالح العمل ہوں گے انہیں اللہ زمین میں حکومت عطا کرے گا۔ جس طرح ان شرائط کے پورا کرنے والوں کو اس سے قبل، وراثتِ ارض کی نعمتوں سے مالا مال کیا گیا۔

یہ استخلاف (وراثتِ ارض) کس غرض کے لئے ہوگی؟ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (۲۴/۵۵)، تاکہ وہ نظام نہایت مضبوطی سے قائم کر دیا جائے جو اللہ نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (۲۴/۵۵)، تاکہ ان کی حالتِ خوف کو کامل امن و سکون سے بدل دیا جائے اور اس طرح يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا (۲۴/۵۵)، یہ صرف قوانین الٰہیہ کے مطیع و محکوم ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت ان سے اپنی حاکمیت نہ منوا سکے۔

یہ ہے وہ استخلاف، حکومت، جو وراثتِ ارض سے متعلق اس قانونِ سرمدی کی رو سے حاصل ہوتی ہے جو ہمارے پیشِ نظر موضوع کا ممدوح ہے۔

لیکن اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ سوال اس قدر اہم ہے کہ اگر اس کا صحیح جواب سامنے نہ آئے تو اصلاح اور فساد کا فرق نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور انسان تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر صالحیت کی اس شرط کو پورا کرنے سے جو حکومت و مملکت عطا ہوتی ہے، وہ خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ یَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ تو جو حکومت و سلطنت فقط مادی قوتوں کے زور سے حاصل کی جاتی ہے۔ کیا وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتی؟ اسے کون دیتا ہے؟ اگر آپ بغور دیکھیں گے تو اس سوال کے ڈانڈے مسئلہ تقدیر سے جا ملیں گے۔ مسئلہ تقدیر کی بحث بڑی تفصیل طلب[1] ہے۔ اور اس وقت ہمارے موضوع سے خارج۔ اس مقام پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ جس انداز سے یہ مسئلہ عام طور پر مسلمانوں کے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اور جس کی وجہ سے یہ قوم گذشتہ ایک ہزار برس سے راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔ اس سوال کا محرک بھی وہی ہے۔ تقدیر کا یہ مفہوم بنو امیہ کے زمانہ کی تخلیق ہے جسے انہوں نے اپنی ملوکیت کے استبداد کے "شرعی جواز" کی غرض سے وضع کیا اور پھر سیاسی حیلہ کاریوں سے اس طرح پھیلایا کہ یہ ایک حقیقتِ ثابتہ بن کر، امت کے قلوب کی گہرائیوں میں سرایت کر گیا اور وہاں سے آج تک نہیں نکل سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک دولت اور قوت، حکومت و سطوت فی ذاتہٖ "خدا کی نعمت" اور اس کی "عطا فرمودہ" قرار پا چکی ہے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ دولت و قوت کس طریق سے حاصل کی گئی ہے اور اسے کس مصرف میں لایا جا رہا ہے؛ ہم جب دولتمند کا ذکر کرتے ہیں، بلا تامل کہہ دیتے ہیں کہ اس پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ ہر صاحبِ شوکت و سطوت کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ "اللہ کی دین" ہے۔

[1] اس کی تفصیلی بحث کے لئے معارف القرآن، جلد اوّل دیکھئے۔

اس غیر محسوس عقیدہ کی رو سے ہمارے نزدیک دولت "خدا کی نعمت" ہے خواہ وہ کسی نے ڈاکہ ڈال کر حاصل کی ہو یا بطریقِ طیب۔ ہمارے ان قدیمی تصورات کی رو سے "حکومت" اللہ کا انعام ہے خواہ اسے ابلیسی تغلب اور طاغوتی سیاست کے بل بوتے پر قائم رکھا ہو، یا ایمان و عمل صالحہ، کی بنا پر۔ غور کیجیئے! ہماری زبان میں "اللہ کی دین" کے مقابلہ میں کسی اور کی دین کے لئے کوئی اصطلاح ہی موجود نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک ڈاکو کو بھی خدا دیتا ہے اور ایک مرد کاسب کو بھی۔ لہٰذا طاغوتی قوتوں کی حکومت بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور اس لئے یہ بھی کے قانون وراثت (یرثہا عبادی الصالحون) کے تابع، اور اس بنا پر صالحون کے معنی ہو جاتے ہیں ہر وہ قوم جو حکومت قائم کرنے کی قوت پیدا کرلے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر فرعون کی حکومت بھی اسی قانون خداوندی کی رو سے ملی تھی تو حضرت موسیٰؑ کو اس کے خلاف، اتنی بڑی مہم کے لئے کیوں مامور کیا گیا تھا؟ اگر باطل کا دولتی نظام بھی اسی ابدی قانون وراثت کا نتیجہ ہوتا ہے تو اس کی جگہ حق کا نظام قائم کرنے کے لئے اس قدر سرفروشیوں اور جاں سپاریوں کی تاکید کیوں کی جاتی ہے؟ حق و باطل کی یہ کشمکش و پیکار تو اسی بنا پر ہے کہ ان میں سے ایک (باطل) منجانب اللہ نہیں ہوتا۔ اگر قانونِ وراثت ارض، صرف حصول قوت ہی کا دوسرا نام ہے تو اس کے لئے عرش عظیم سے آنے والے پیغامات کی کیا ضرورت ہے۔ اسے تو دنیا کا ہر طالع آزما اور ہر چنگیز خاں از خود جانتا ہے۔ اگر نیٹشے کا مافوق البشر، قرآن کا مرد مومن ہے۔ تو پھر حکمت فرعونی اور حکمتِ کلیمی میں کیا فرق ہے؟ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ خالص قوت کی بنا پر جو نظامِ حکومت قائم کر لیا جاتا ہے اسے خدا کے متعین فرمودہ قانونِ وراثت کا نتیجہ، اور فلہٰذا من جانب اللہ نہیں کہا جا سکتا۔ منجانب اللہ استخلاف فی الارض وہی ہوتا ہے جو اس کے قانون سرمدی کا نتیجہ اور قرآنی صالحیت کا ثمرہ ہو۔ اور یہی وہ استخلاف ہے جو ہمارے موضوع کا عنوان ہے۔ اور اسی سے مسلمان کو سروکار ہونا چاہیئے۔

صالحیت کا قرآنی مفہوم متعین کرنے کے بعد، اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔ وراثت ارض یعنی قوانین الٰہیہ کے مطابق حکومت قائم کرنے سے پہلے، عام طور پر۔ قوم کی حالت یا تو یہ ہوگی کہ ان پر کسی دوسرے کی حکومت نہیں ہوگی۔ یعنی یا تو ان کی اپنی حکومت ہوگی لیکن ہی غلبہ و تسلط کے آئین کے مطابق جس کی رو سے عام انسانی حکومتیں قائم ہوتی ہیں۔ یا سرے سے کسی دولتی نظام کا وجود ہی نہ ہوگا۔ اور قوم قبائلی قسم کی زندگی بسر کر رہی ہوگی۔ یا دوسری صورت میں قوم کسی مستبد حکومت کی محکوم ہوگی۔ اوّل الذکر صورت میں یعنی جب حکومت اپنی ہو یا سرے سے کسی منظم حکومت کا وجود ہی نہ ہو، اس قوم کو اس امر کی امکانی قدرت حاصل ہوگی کہ وہ چاہے تو اپنے اندر صالحیت پیدا کرکے۔ آئین فطرت کے مطابق وراثت ارض کی دولت سے متمتع ہو جائے۔ اس صورت میں مقابلہ ان لوگوں سے ہوگا جو اس انداز کے حکومت کے قیام میں اپنی ذاتی اغراض کا نقصان عذیاں سمجھتے ہوں اور اس لئے اس تحریک کی مخالفت میں سرگرم عمل ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ قوم یا تو فریق مخالف پر غلبہ حاصل کرلے گی اور اگر اس کا فوری امکان نہ ہوگا تو کسی اور خطۂ ارض کی طرف ہجرت کرکے اسے اس آئین حکومت کی قرارگاہ بنائے گی۔ یہ وراثت ارض فطری نتیجہ ہوگی ان کی صالحیت کا۔ نبی اکرمؐ کی دعوت کے وقت، قوم مخاطب کی یہی حالت تھی۔ عرب کسی غیر حکومت کے تابع نہیں تھے۔ قبائلی زندگی بسر کرتے اور اپنی روایات کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ کر لیتے تھے۔ اس لئے انہیں امکانی قدرت حاصل تھی کہ وہ چاہتے تو اپنے اندر داخلی تبدیلیاں پیدا کرکے وراثت ارضی کے مستحق بن جاتے۔ نبی اکرمؐ کی بصیرت افروز تعلیم اور حقیقت کشا عمل سے اس قوم نے وہ تربیت حاصل کرلی، جس سے ان کے خفتہ جوہر بیدار ہو گئے اور وہ قوم اصلح بن کر استخلاف فی الارض کے مقام محمود تک پہنچ گئی۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ یہ خدا کے عدل کا مظاہرہ تھا۔

دوسری صورت کی مثال ہمارے سامنے قوم بنی اسرائیل کی ہے جو دعوت

حضرت موسیٰ کے وقت فرعون مصر کے پنجۂ قہرمانیت میں گرفتار تھی جسے قرآن نے سوء العذاب اور بلاء عظیم کی جامع اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔ ان پر فرعونی حکومت کے مستبد قوانین مسلط تھے اس لیے وہاں رہتے ہوئے انہیں اس امر کی امکانی قدرت حاصل نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے جوہر خوابیدہ کو بیدار کر کے ان میں نمود و بالیدگی پیدا کر سکیں۔ اس کے لئے آزاد فضا کی موجودگی نہایت ضروری تھی۔ یعنی بالفاظ دیگر صورت یہ پیدا ہو چکی تھی کہ۔

(۱) جب تک وہ اپنے اندر صالحیت نہ پیدا کر لیں، آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی۔

(۲) لیکن صالحیت پیدا نہیں ہو سکتی تھی جب تک وہ فرعون کے پنجۂ استبداد سے آزاد نہ ہو جائیں۔

عدل کی رو سے انہیں ہمیشہ کے لئے فراعنہ کی غلامی میں رہنا چاہیے تھا۔ لیکن خدا کے ہاں عدل کے ساتھ احسان بھی ہے۔ احسان کا تقاضا تھا کہ انہیں اس مستبد حکومت کی غلامی سے نجات دلا کر وہ امکانی قدرت عطا کر دی جاتی (یعنی ایسے مواقع پیدا کر دیے جاتے) جس سے وہ اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے وراثت ارض کی نعمت عظمیٰ کے مستحق بن جاتے۔ یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جسے قرآن نے ان درخشندہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ (۲۸/۵-۶)

اور ہم نے چاہا کہ وہ لوگ جنہیں ملک میں (غلامی و محکومی کے شکنجوں میں جکڑ کر) بے حد کمزور کر دیا گیا تھا، ان پر احسان کریں۔ اور انہیں امام (قوموں کی قیادت کرنے والے) بنائیں۔ اور انہیں (حکومت و مملکت کا) وارث بنائیں اور (اس طرح) انہیں زمین میں تمکن کر دیں۔

لہٰذا انہیں فرعون کی غلامی سے نجات، بطور انعام موہبت کر دی گئی اور انہیں آمن کی وادیوں میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں ان پر کسی غیر کی حکومت نہ تھی اور اس طرح ان کے لئے ایسی امکانی قدرت

پیدا کر دی گئی کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو تربیت دے کر وراثت ارض کے مستحق بن جائیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان بالکل اسی طرح ملا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وراثت ارض یا استخلاف ہے، وہ حقیقت سے بے خبر ہیں۔ وراثت ارض بلامزد و معاوضہ نہیں ملا کرتی۔ وہ فطری نتیجہ ہوتی ہے صالحیت کا، اور صالحیت ایمان اور اعمال صالحہ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی انعاماً اور احساناً صرف غیروں کی غلامی سے رستگاری عطا ہوتی ہے تاکہ اس سے صالحیت پیدا کرنے کی امکانی قدرت نصیب ہو جائے۔ ہمیں اس وقت صرف ایک خطۂ زمین ملا ہے جس پر کسی کی حکومت نہیں۔ اب ہم چاہیں تو

(۱) اپنے اندر صالحیت پیدا کر کے اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا تخت اجلال بچھا دیں۔

(۲) صرف مادی قوتوں کے زور سے غلبہ و استیلا پیدا کر کے اسی قسم کی سلطنت تشکیل کریں۔ جس قسم کی سلطنتیں دوسری طاغوتی قوتوں نے قائم کر رکھی ہیں۔ اور یا

(۳) موجودہ جمود و تعطل اور بے عملی اور بے حسی کی زندگی سے اس امکانی قدرت کو بھی کھو بیٹھیں اور پھر کسی اور کی غلامی سے بدستور سابق جہنم کی لعنتی زندگی میں گرفتار ہو جائیں۔

ہم نے کہا ہے کہ ہماری حالت ایسی ہی ہے جیسی اس وقت بنی اسرائیل کی تھی۔ اب آیئے دیکھیں کہ اس حالت میں بنی اسرائیل نے کیا کیا۔ اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ وَفِيهَا بَصَائِرُ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ

بنی اسرائیل کو اللہ کی اس موہبت عظمیٰ پر، قدم قدم پر، تشکر و امتنان کے سجدے کرنے چاہیئے تھے۔ یہ انعام کچھ چھوٹا انعام، اور یہ احسان کچھ کم احسان نہ تھا فرعون جیسے مجسمۂ استبداد و قہرمانیت کے دست جور و ستم سے رستگاری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ لیکن صدیوں کی غلامی سے بنی اسرائیل کے جوہر انسانیت قریب قریب مردہ ہو چکے تھے۔ نہ ان کے سینہ میں زندہ آرزوؤں کی مقدس تندیل تھی، نہ ان کی نگاہوں میں بلند مقاصد کی عالمتاب درخشندگی۔ دنیا میں غلامی ہزار لعنتوں کی ایک لعنت اور لاکھ نحوستوں کی ایک نحوست ہوتی ہے۔ غلامی میں وہ تمام عیوب و نقائص

جیسے جیسے انسانیت کیلئے موذآم کہنا چاہیئے۔ اس انداز سے پیدا ہو جاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے تباہ کن اثرات کب اور کن راہوں سے خون کے اندر حلول کر گئے۔ غلامی میں انسان زندگی کے حقائق کے مقابلہ سے جی چراتا ہے اور قفس کے خوگر پرندے کی طرح، اس عافیت کوشی کی زندگی کو عین حیات سمجھ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

صدیوں کی غلامی سے ان میں عزم و استقلال کے جوہر بہت کم رہ گئے تھے۔ محکومی سے تن آسانی او سہل انگاری کی افسردگی ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی اور وہ اس نہج زندگی کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ ان پر

قفس ہوا تھا حلال اور آشیانہ حرام

نتیجہ اس کا یہ کہ وہ ہر انقلاب آفریں تدبیر میں مصائب و مشکلات کے طوفان پوشیدہ دیکھتے تھے۔ تبدیلیٔ احوال کے تصور سے ان کا دل بیٹھنے لگتا تھا۔ حضرت موسیٰ انہیں بار بار تاکید کرتے تھے کہ ذرا ہمت اور استقلال سے کام لو اور پھر دیکھو کہ اللہ کی تائید و نصرت کس طرح تمہارے سامنے ہوتی ہے۔ راستہ کی مشکلات کو استقامت سے برداشت کر جاؤ۔ انجام کار میدان تمہارے ہی ہاتھ رہے گا۔ ذرا اپنے اندر صالحیت پیدا کر لو۔ وراثت ارض تمہارے لئے مقدر ہو چکی ہے۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (۷/۱۲۸)

تب موسیٰ نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ خدا سے مدد مانگو اور راہ میں جمے رہو۔ بلاشبہ زمین (کی بادشاہت) صرف خدا کے لئے ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اپنے قانون مشیت کے مطابق اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام کار انہی کے لئے ہے جو متقی ہوئے۔

لیکن اس تذکیر و تنذیر سے ان پیکرانِ آب و گل کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑانا آسان نہ تھا۔ حضرت موسیٰ انہیں عزم و استقلال کے لئے ابھارتے تھے اور وہ شکوہ سنج ہوتے کہ "تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبتوں میں رہے۔ اور اب تمہارے آنے کے بعد ان میں اور بھی اضافہ ہو گیا"۔ ہم سمجھے تھے کہ اب آرام سے گذرے گی لیکن تم نت نئے دن ایک نیا مرحلہ سامنے لے آتے ہو، تم اچھے چارہ ساز بن کر آئے۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (۷ ؍ ۱۲۹)

انہوں نے کہا کہ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیتیں پہنچ رہی تھیں اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ موسیٰ نے کہا کہ قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمہیں استخلاف فی الارض عطا فرمائے۔ پھر دیکھے کہ تم کیسے کام کرتے ہو!

لیکن جن لوگوں کی ہڈیوں کے گودے کے اندر تک محکومیت کے جراثیم گھر کر چکے ہوں، جو خوئے غلامی میں پختہ ہو چکے ہوں ان پر بھلا ان حیات آور خطبات اور زندگی بخش پیغامات کا کیا اثر ہو؟ جب حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے نکال کر لے چلے ہیں تو وہ اس طرح پا بجولاں جا رہے تھے۔ جیسے کہیں بیگار میں پکڑے جا رہے ہوں۔ جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے اور پیچھے سے فرعون کا لشکر تعاقب میں آیا تو انہوں نے چلانا شروع کر دیا کہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیل کر لے آئے ہو؟

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ (۲۶ ؍ ۶۱)

جب دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بنی اسرائیل نے کہا کہ ہم یقیناً دھر لئے گئے۔

تورات میں ہے۔

اور جب فرعون نزدیک ہوا اور بنی اسرائیل نے آنکھیں اوپر کیں اور مصریوں کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تو وہ شدت سے ڈرے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی اور موسیٰ سے کہا کہ کیا مصر میں قبروں کی جگہ نہ تھی کہ تو ہم کو بیابان میں مرنے کے لئے لایا؟ تو نے ہم سے یہ کیا معاملہ کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا یہ وہی بات نہیں جو ہم نے مصر میں تجھ سے کہی تھی کہ ہم سے ہاتھ اٹھا تاکہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا　　　(خروج ۱۴ ۔ ۱۰ تا ۱۲)

غور کیجئے! غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح چھلک کر باہر آرہی ہے جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مصریوں کی خدمت گذاری اس سے کہیں بہتر تھی۔ اس سے بڑی بدبختی اور کس کی ہوگی جو قفس کو آشیانہ سے بہتر سمجھے کہ آشیانہ میں کہیں خوفِ برق ہے کہیں خطرۂ صرصر۔ کبھی فکرِ معاش ہے اور کبھی خدشۂ صیاد۔ قفس کی زندگی میں یہ تمام تفکرات و خدشات آقا کے ذمہ تھے۔ اللہ اکبر! "حکمراں کی ساحری" بھی کس درجہ کامیاب ہوتی ہے جو انسان کی فطرت بدل دیتی ہے وہ فطرتِ صحیحہ جو انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

ایسی درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ خطرہ نہیں، بلکہ خطرہ کا تصور بھی اسے مرگِ ناگہانی بن کر دکھائی دیتا ہے۔ محکومیت کی افیون سے اس کے قوائے عملیہ اس درجہ مخدر ہو جاتے ہیں کہ جدّ و جہد اور سعی و کاوش کی زندگی اس کے لئے مصیبت بن جاتی ہے۔ عافیت کوشی اور سہل انگاری ہے۔ کہ جس کے لئے حاکم قوم کی طرف سے خاص طور پر اسباب و ذرائع مہیا کئے جاتے ہیں۔ ان کی قوت برداشت بالکل سلب ہو جاتی ہے اور وہ بات بات پر جھلا اٹھتے ہیں۔ محکومیت کا زہر کس قدر میٹھا، خواب آور اور چپکے چپکے، غیر محسوس طور پر موت کی طرف لیجانے والا ہوتا ہے!

یہی زہر تھا جو بنی اسرائیل کے خون کے ہر ذرہ میں سرایت کر چکا تھا اور انہیں ذرا سی تکلیف پر اس امر کا دلی تاسف ہوتا تھا کہ ہم مصر کی محکومیت سے کیوں آزاد ہو گئے! چنانچہ تورات میں دوسری جگہ ہے۔

> پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت زمینِ مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرھویں دن سین کے بیابان میں جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور ساری جماعت بنی اسرائیل کی اس میدان میں موسیٰ اور ہارون پر جھنجلائی۔ اور بنی اسرائیل بولے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے، زمینِ مصر میں جس وقت کہ ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھتے تھے اور روٹی من بھر کے کھاتے تھے مارے جاتے۔ کیونکہ تم ہم کو اس بیابان سے نکال لائے ہو کہ سارے مجمع کو بھوک سے ہلاک کرو۔ (خروج ۱۶ : ۱ - ۳)

آپ نے دیکھا ہے کہ انہیں کس چیز کی یاد ستا رہی تھی؟ گوشت کی ہانڈیوں کی! یعنی جیل خانے کی روٹیوں کی یاد! یا للعجب!! سحر حکمرانی کس قدر قلب ماہیت پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے دیدۂ شاہیں میں نگہ خفاش رکھدی جاتی ہے، جو جہنم کے شجرۃ الزقوم کو ثمر بہشت بنا کر دکھاتی ہے یہی کیفیت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی۔ ایک میدان میں پہنچے جہاں ذرا پانی کی قلت تھی تو پھر وہی واویلا مچانا شروع کر دیا کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے ہو؟

> تب بنی اسرائیل کی جماعت نے...... رفیدیم میں ڈیرا ڈالا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا۔ سو لوگ موسےٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ ہم پئیں۔ موسیٰ نے انہیں کہا کہ تم مجھ سے کیوں جھگڑتے ہو اور خداوند کا کیوں امتحان کرتے ہو؟ اور وہ لوگ پانی کے پیاسے تھے۔ سو لوگ موسےٰ پر جھنجلائے اور کہا کہ تو ہمیں مصر سے کیوں نکال لایا کہ ہمیں اور ہمارے لڑکوں کو اور ہماری مویشی کو پیاس سے ہلاک کرے۔
>
> (خروج ۱۷ : ۱ - ۳)

غرضیکہ وہ قدم قدم پر روٹھ جاتے تھے اور ہر بار یہی طعنہ دیتے تھے کہ ہمیں مصر سے کیوں نکال لائے؟ قرآن کریم نے اس قوم کی داستانِ زندگی کو جو اس طرح اپنے دامن میں محفوظ کر رکھا ہے اور مختلف مقامات پر اسے بار بار سامنے لاتا ہے تو اسی لئے کہ اس کے اندر ہر دیدۂ بینا کے لئے عبرت و موعظت کے ہزار ساماں پوشیدہ ہیں۔ مدتوں کی غلامی سے قوموں کی کیا حالت ہو جاتی ہے؟ اس کا اندازہ لگانا ہو تو داستانِ بنی اسرائیل کو غور سے پڑھئے۔ چنانچہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ اللہ کی وہ موہبت و نعمت جو انہیں بلا محنت و مشقت مل گئی تھی ان کے لئے وبالِ جان اور بلائے بے درماں بن رہی تھی۔

کجو دکے می رسد ایں راہ پیمائے تن آسانے
ہزاراں سال منزل در مقامِ آذری کردہ

انہیں مصر کی لعنتی زندگی سے نکال کر سینا کے میدانوں میں اس لئے لایا گیا کہ وہ اپنے جوہرِ خودی کی تربیت کریں اور اس طرح اپنے اندر ایسی فولادی سیرت پیدا کر لیں کہ وہ مصائبِ زندگی میں ہر مشکل کا مقابلہ کر سکے۔ اور یوں اپنے پیکرِ خاکی کے ذراتِ کہن کو ترکیبِ نو دیکر اس سے ایک جہانِ دیگر کی تعمیر کر لیں کہ جو وراثتِ ارض کی قرارگاہ بن جائے۔ لیکن ان کی جو حالت تھی وہ آپ کے سامنے ہے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کا دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ اور عجیب و غریب مطالبات پیش کرتے۔ سینا کی وادیوں سے گذرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں کے لوگ کسی بُت کی پوجا کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کا ہاتھ پکڑ کر کھڑے ہو گئے کہ ہمیں بھی ایسا ہی بُت بنوا دیجئے: قَالُوا يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ (۷/۱۳۸)، حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ جب چند روز کے لئے طور کی چوٹیوں پر تشریف لے گئے تو انہوں نے گوسالۂ سامری کی پرستش شروع کر دی۔ جب ان سے کہا گیا کہ تورات کے احکام کی پابندی کرو کہ یہ احکام تمہارے خدا نے دیئے ہیں تو اڑ کر بیٹھ گئے کہ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً (۲/۵۵) "ہم کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم خدا کو کھلے طور پر نہ دیکھ لیں" وادیٔ ایمن میں صحرا کی صاف و سادہ غذا

مائدۂ فطرت پر کھانے کو ملتی تھی۔ لیکن انہیں رہ رہ کر شہر کی، مسالہ دار، زندگی کی یاد ستاتی تھی چندروز کے بعد منہ بسور کر بیٹھ گئے کہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ (۲/۶۱) ہم سے ہر روز ایک ہی چیز نہیں کھائی جائے گی۔

جب محکوم قوم کے قوائے عملیہ مضمحل اور ان کے جوہر مردانگی مسلوب ہو جاتے ہیں تو ان کے پاس فقط باتیں ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں عمل کے بجائے شاعری شروع کر دیتی ہے، بات بات پر منطقی موشگافیاں، قدم قدم پر فلسفیانہ نکتہ آرائیاں۔ زندہ قوموں کا شیوۂ زندگی ہوتا ہے "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" سنا اور اس پر عمل پیرا ہو گئے۔ وہ کام زیادہ کرتے ہیں اور باتیں بہت کم۔ لیکن محکوم قوم باتیں ہی باتیں کرتی ہے، کام بالکل نہیں کرتی۔ یہی حالت بنی اسرائیل کی ہو چکی تھی اُن سے کہا گیا کہ ایک گائے ذبح کر لو۔ کس قدر صاف اور سیدھی بات تھی۔ لیکن سورۂ بقرہ کو اٹھا کر دیکھئے۔ انہوں نے اس پر بھی کتنی باتیں بنائی ہیں اور کس طرح بال کی کھال نکالنا شروع کی ہے۔ یہ ہوتی ہے محکوم کی ذہنیت!

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ مصر سے خروج، بنی اسرائیل کے لئے مقصود بالذات نہ تھا۔ فرعون کی محکومیت سے رستگاری اس مقصد کے لئے ہوئی تھی کہ یہ قوم صحرائے سینا کی تربیت گاہ میں اپنے اندر صالحیت کے جوہر پیدا کرے۔ تاکہ ارضِ مقدس (فلسطین) کی وراثت ان کے حصہ میں آ جائے۔ حضرت موسیٰؑ انہیں سرزمین فلسطین کے کنارے تک لے گئے اور ان سے کہا کہ یہ ہے وہ زمین جو تمہارے خدا نے تمہارے نام لکھ دی ہے۔ اٹھو اور اس پر قبضہ کر لو۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ (۵/۲۱)

لوگو اس مقدس سرزمین میں جسے خدا نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے (یعنی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ عزم و ہمت کے ساتھ) داخل ہو جاؤ۔ اور الٹے پاؤں پیچھے

کی طرف نہ بڑھو کہ کامیاب ہونے کی بجائے ، نقصان اور تباہی میں پڑ جاؤ گے۔

لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ ضعفِ خودی سے ان پر خوف طاری تھا۔ سپاہیانہ عزم کے تصور سے ان پر رعشہ چھا جاتا تھا۔ فریقِ مقابل کے آدمی انہیں دیو نظر آتے تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔

قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ؀ (۵/۲۲)

لوگوں نے اس کے جواب میں کہا اے موسیٰ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بہت ہی زبردست ہیں (ہم میں ان کے مقابلہ کی تاب نہیں) جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ ہاں اگر وہ لوگ وہاں سے از خود نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔

ذرا غور کیجئے اس منطق پر کہ فریقِ مقابل از خود وہاں سے نکل جائے۔ ہم پھر آگے بڑھیں گے۔ حضرت موسیٰؑ نے بہتیرا سمجھایا لیکن ان پر اس پند و موعظت کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔

قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ؀ (۵/۲۴)

وہ بولے۔ اے موسیٰ، جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں (اور اگر تم وہاں جانے پر ایسے ہی مصر ہو تو) تم خود چلے جاؤ اور تمہارا خدا بھی تمہارے ساتھ چلا جائے تم دونوں وہاں ان کے ساتھ لڑنا (جب فتح ہو جائے ہمیں آواز دے دینا) ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

لیجئے جواب مل گیا کہ ہماری بہبودی کی ایسی ہی تڑپ ہے تو جائیے۔ ان لوگوں سے لڑیئے اور اپنے ساتھ (معاذ اللہ) اپنے اس خدا کو بھی لے جائیے جس نے فتح و کامرانی کا وعدہ دے رکھا ہے۔ ہم یہاں انتظار کرتے ہیں۔ جب دشمن مغلوب ہو جائے تو ہمیں آواز دے لینا ہم پہنچ جائیں گے۔

اللہ اکبر! کیا ذہنیت ہے غلام کی!!

اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ کیا وہ لوگ وراثتِ ارض کے مستحق بھی بلا محنت و مشقت ہو گئے؟ کیا انہیں وہ سرزمین یونہی اتفاقاً مل گئی! بالکل نہیں۔

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۞ (۵/۲۶)

اللہ کا حکم ہوا کہ جب ان لوگوں کی حالت یہ ہے تو، اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی۔ یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے۔ سوائے موسیٰ تم ان نافرمان لوگوں کے اس مآل پر غمگین مت ہو (وہ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرنا چاہتے اس لیے وہ اس محرومی کے مستحق ہیں)

چنانچہ حضرت موسیٰؑ آب و گل کے ان پیکروں کو چالیس برس تک جنگلوں اور صحراؤں میں پھراتے رہے تاکہ اس افیون خوردہ جماعت کا کوئی فرد باقی نہ رہے۔ اور جب ان کی نئی نسل جن کی تربیت مصر کی محکومی کی فضا سے الگ کرکے کی گئی تھی، بڑھ کر جوان ہو اور وہ اپنے اندر اس صالحیت کو پیدا کر لے جو وراثتِ ارض کے لئے شرط ہے، تو پھر ان کے ہاتھوں خدا کا نوشتہ پورا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب اس نئی پود نے اپنے اندر صالحیت پیدا کر لی تو وہ ایک ہی جست میں تمام منازل طے کر گئے اور استخلاف فی الارض کی مسند پر متمکن ہو گئے۔ كَذٰلِكَ ۚ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۞ (۲۶/۵۹)

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۚ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا (۷/۱۳۷)

اور جس قوم کو حقیر و کمزور خیال کیا جاتا تھا اسی کو ملک کے مشرقی و مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے، وارث کر دیا، اور اس طرح تیرے اللہ کی

بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی اس لئے کہ وہ ہمت اور استقامت سے جمے رہے تھے۔

یہ وراثت، صالحیت کا فطری نتیجہ تھی اور صالحیت، جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے، ایمان محکم اور عمل پیہم سے پیدا ہوتی ہے اسی کو قرآن نے - ایقان اور صبر - کی جامع اصطلاح سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ۝ (۲۴-۳۲)

اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے امام بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی قیادت کرتے تھے

اور یہ اس لئے تھا کہ انہوں نے ثبات واستقامت کا ثبوت دیا اور وہ ہماری آیات پر

محکم یقین رکھتے تھے۔

یہ ہیں داستان بنی اسرائیل کے وہ اجزاء، جو ہمارے موضوع زیر نظر سے براہ راست متعلق ہیں۔[1] اس میں - - - استخلاف فی الارض وراثت زمین - کے سلسلہ کی دو متمیز درمیانی کڑیاں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جسے ابتدائی حصہ کہنا چاہیئے۔ جس میں غیروں کی محکومیت سے اس لئے رستگاری ملتی ہے کہ اس قوم کو اپنی صلاحیتوں کے نمود وارتقاء کے لئے امکانی مواقع مل جائیں۔ اور دوسرا حصہ وہ ہے جس میں صالحیت کی پختگی کے بعد وہ قوم وراثت ارض کی مستحق قرار پا جائے۔ حصول صالحیت کا ابتدائی مرحلہ ہو یا استخلاف و وراثت کا آخری حصہ، دونوں میں مواقع اس لئے بہم پہنچائے جاتے ہیں کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ وہ قوم اس قدرت واختیار سے کس طرح فائدہ اٹھاتی ہے۔ پہلے مرحلہ میں یہ دیکھا جائے گا کہ وہ قوم اپنے اندر صالحیت پیدا کرتی

---

[1] داستان بنی اسرائیل اپنے اندر عبرت وموعظت کے بڑے سامان رکھتی ہے اور ہمارے حالات پر تو یہ اس طرح منطبق ہوتی ہے کہ جو باریک بین نگاہ اسے دیکھے گی بیساختہ پکار اٹھے گی کہ ؎ اے دل یہ تو اپنی داستان معلوم ہوتی ہے

اس داستان کی تفاصیل و تضمنات، معارف القرآن جلد سوم میں ملیں گی۔ اس مضمون کا یہ حصہ بھی بیشتر اسی سے ماخوذ ہے۔

ہے یا نہیں۔ اور دوسرے میں یہ کہ قوت و اختیار ملنے کے بعد وہ قوم اس کا استعمال صحیح طور کرتی ہے یا نہیں۔ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے، جبکہ وہ ابھی فرعون کے زیر حکومت تھی کہا...... وَ یَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝ "بہت قریب ہے کہ اللہ تمہیں استخلاف فی الارض عطا کر دے۔ پھر دیکھے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو" اور قوم محمد رسول اللہ سے کہا گیا کہ

وَلَقَدْ اَهْلَکْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ وَمَا کَانُوْا لِیُؤْمِنُوْا ۭ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

اور یقیناً ہمارے قانون مکافات عمل نے، تم سے پہلے کئی نسلوں کو ہلاک کر دیا (۱۰/۱۳-۱۴) جب ان کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ رجادۂ عدل و انصاف سے ہٹ کر ظلم کرنے لگ گئے (حالانکہ ان کے رسول ان کے پاس واضح حقائق لے کر بھی آئے لیکن بایں ہمہ ایسا نہ ہوا کہ وہ ایمان لے آتے) اس طرح ہم مجرم اقوام کو سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں زمین کی حکومت عطا کی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو!

لہٰذا امکانی مواقع یا قوت و اختیار کے خزانے اس لئے ملتے ہیں لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ

۷

ان اصول و مبادیات کو سمجھ لینے کے بعد اب اپنی موجودہ حالت کی طرف آئیے اور اسی آئینے میں اسے بھی دیکھئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی سرزمین ہمیں بغیر صلاحیت کے مل گئی ہے۔ یہ ہماری سعی و عمل، تگ و تاز کا نتیجہ نہیں۔ ہمارے اندر تعداد وہ داخلی تبدیلیاں پیدا نہیں ہوئیں جن کا مظہر خارجی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ کیا عوام اور کیا خواص، ہم سب اسی سطح پر کھڑے ہیں جہاں اس سے پہلے تھے صلاحیت تو بہت بڑی چیز ہے، ہم میں تو وہ صلاحیت و استعداد بھی پیدا نہیں ہوئی جو محض مادی

قوتوں کی بنا پر حصول مملکت و سلطنت کے لئے، زندہ رہنے کی متمنی قوموں میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ ان قوموں کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے جنہوں نے اپنے اغراض و منافع اور ذاتی مقاصد سطامع کی خاطر، دوسروں کے نظام سلطنت سے رستگاری حاصل کرنے، یا اپنے تصورات کے مطابق بساط حکومت بچھانے کے لئے جدوجہد کی، اور پھر دیکھئے کہ اس باب میں انہیں کیا کیا مصائب برداشت کرنے پڑے اور انہوں نے ان سب شدائد و نوائب کا کس پامردی و استقامت، حوصلہ اور ہمت، عزم و استقلال سے مقابلہ کیا اور اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر کس طرح مستانہ وجانفروشانہ انداز سے، ہر مخالف قوت کی صفیں چیرتے ہوئے، آگے بڑھتے چلے گئے ابھی کل کی جنگ عمومی کو دیکھئے محض ملکی حفاظت اور قومی اجارہ داریوں کی حصارت کے لئے مختلف اقوام مغرب نے کس کس ایثار و قربانی سے نامساعدت حالات کا مقابلہ کیا ان سب حقائق کو سامنے رکھئے اور۔ باز بخوانید این دفتر۔ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ ہم میں فی الواقعہ عام قومی خصائص بھی پیدا نہیں ہوئے چہ جائیکہ ہمارے اندر صفات الٰہیہ منعکس ہوں اور ہم صبغۃ اللہ کے مشہود پیکر دکھائی دیں۔

باد سے نرسیدی خدا چہ می جوئی

گذشتہ ابتلا ء و انتشار میں، ہم نے ایک طرف جس عدم تدبر اور افلاس نظر اور دوسری طرف جس فقدان ضبط و استقامت اور حرمان عزم و ثبات کا مظاہرہ کیا ہے۔ نہیں! اس سے بھی آگے بڑھئے ہم نے ایک طرف جن کفن دزدیوں اور مردارخوریوں، جن "یوسف فروشیوں" اور "یعقوب فریبیوں" اور دوسری طرف جن افراتفریوں اور نفسا نفسیوں، جن ضابطہ شکنیوں اور آئین فراموشیوں کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اس حقیقت کی زندہ شہادتیں ہیں کہ ہم اس وقت زندہ قوموں کے زمرہ میں شمار ہونے کے قابل اور حکومت و مملکت کے مستحق کہلانے کے اہل قطعاً اور حتماً نہیں ہیں۔ لہٰذا غیروں کی حکومت سے نجات اور اس خطۂ زمین کی موہبت، محض انعاماً و احساناً ہوئی ہے، جس طرح بنی اسرائیل کی۔ فرعون کی غلامی سے رہائی اور سینا

کی وادیوں میں پرچشم کشائی، محض اعزاز و اکرام ہو گئی تھی۔ اس کے لئے خدا کی طرف سے کیا اسباب و ذرائع پیدا کئے گئے، اور احوال و ظروف کس طرح ایک خاص نہج و ترتیب پر تشکل ہوتے چلے گئے، یہ ایک الگ بحث ہے۔ حقیقت یہی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے کہ یہ نتائج جو اس طرح مرتب ہوئے ہیں، ہماری استعداد و اہلیت کا ماحصل اور ہماری سعی و کاوش کا ثمرہ نہیں ہیں۔ یہ ہمیں بلا مزد و معاوضہ اور بلا محنت و مشقت خدا کی طرف سے احساناً ملے ہیں۔ اور یہ اس لئے ہیں "لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ" غیروں کی حکومت میں ہمیں یہ مواقع حاصل نہیں ہو سکتے تھے کہ ہم اس صالحیت کو پیدا کر سکیں جو وراثت ارض کے لئے بنیادی شرط ہے یہ خطۂ زمین ان ہی مواقع کو بہم پہنچانے کے لئے عطا ہوا ہے۔ یہ کھلا میدان اس لئے دیا گیا ہے کہ لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ (تاکہ یہ دیکھ لیا جائے کہ ہم کیسے کام کرتے ہیں۔)

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، صالحیت مشروط ہوتی ہے ایمان و اعمال صالحہ پر۔ چنانچہ سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ﴿۹﴾

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور (اس کے ساتھ) صالح العمل ہوتے ہیں تو ہم ان کو یقیناً صالحین کے زمرہ میں شامل کریں گے۔

اس حقیقت کو بھی قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ راہ پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی روش ہے اس میں بڑی بڑی تکالیف کا مقابلہ اور شدید مصائب کا سامنا ہوگا۔ مومن وہی ہے جو ان مصائب کو مردانہ وار برداشت کرے۔ جو اس راہ میں تکالیف سے جی چرائے، وہ مومن نہیں، قرآن کی رو سے منافق ہے۔ چنانچہ آیۂ مندرجہ صدر کے ساتھ ہی فرمایا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ وَلَئِن جَاءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ

اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝

اور لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں (۲۹/۱۰-۱۱)۔ لیکن حالت یہ ہوتی ہے کہ جب اللہ کی راہ میں دکھ اٹھانا پڑتا ہے، تو لوگوں کی طرف سے آنے والی مصیبتوں کو اللہ کا عذاب سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن اگر تیرے اللہ کی طرف سے نصرت آئے تو اس (فتح و کامرانی کے وقت) پکار اٹھتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ کیا اللہ نہیں جانتا جو اہل جہان کے سینوں میں ہے؟ (ضرور جانتا ہے) اور اللہ یقیناً مومنین کو بھی دیکھ لیگا اور منافقین کو بھی۔

سو صالحیت کے لئے پہلی شرط جسمانی قربانی ہے اور دوسری شرط مالی ایثار جس کے متعلق فرمایا۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

اور اللہ کے دیئے ہوئے میں سے (اس کی راہ میں) خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو اور وہ اس وقت کہے کہ یا اللہ! تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور کیوں نہ دی تاکہ میں مال خرچ کرتا اور اس طرح صالحین میں سے ہو جاتا۔

یہ اذیتیں اور مشقتیں، ظاہر ہے کہ مخالفین کے مقابلہ سے پیدا ہوں گی۔ یہ مخالفت دو اطراف سے ہوگی۔ ایک تو خارجی دشمنوں کی طرف سے جو اس **امکانی قدرت** (میدان عمل) کو بھی گوارا نہیں کر سکتے، اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اس خطہ زمین پر ان کی حکومت مستقر و متمکن ہو گئی تو ان کا باطل آگیں نظام سب کا سب درہم برہم ہو جائے گا۔ باطل اپنی بنیادی کمزوریوں سے خوب واقف ہوتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ نظام حق و صداقت کے قیام کی مخالفت میں پوری سعی و کاوش سے کام لیتا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی!

لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کو سب سے پہلے ان خارجی اعدا کی مکارانہ سازشوں اور محاربانہ منصوبوں کے مقابلہ کے لئے ہر وقت مستعد رہنا ہوگا کہ اگر ان کی کمزوری یا لاپرواہی سے، خدانخواستہ ان کے مشئوم عزائم بروئے کار آگئے تو یہ امکانی قدرت جسے صالحیت یعنی وراثتِ ارضی کے حصول کا ذریعہ بننا ہے، یہیں ختم ہو کر رہ جائے گی۔ اور کس قدر سوختہ سامان اور شوریدہ بخت ہے وہ قوم، جس کی جھولی میں پڑی ہوئی ایسی متاعِ گراں بہا، اس طرح سے چھن جائے"

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے۔
ویلیتنی متقبل ھذا وکنت نسیاً منسیاً

لیکن ان خارجی دشمنوں سے کہیں زیادہ شدید مخالفت خود اپنوں کی طرف سے ہوگی جو اس انقلاب سے اس لئے خائف ہوں گے کہ اس میں انہیں اپنی ملمع کارانہ سیادت اور ابلہ فریبانہ قیادت کی موت نظر آئے گی۔ یہی وہ گروہ ہے جو ہر زمانہ اور ہر قوم میں، ہر دعوتِ انقلاب حق و صداقت کی مخالفت میں پیش پیش رہا ہے اور قرآن نے جسے مترفین کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے مترفین کے عناصرِ ترکیبی، ان کے نفسیاتی میلانات اور ذہنی رجحانات، ان کے خصائص و لوازم ان کے مقاصد و عزائم کیا ہوتے ہیں، یہ ایک تفصیل طلب بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سردست صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ مترف کے مفہوم میں تن آسان، سہل انگار، نفس پرست، عیش پسند، دوسروں کی کمائی پر آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے عادی، سب داخل ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ ہر رسول کی دعوتِ انقلاب کی مخالفت کیا کرتے تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم

بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿۳۴﴾

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اس کے مترفین نے کہا کہ ہم تمہارے پیغام حق و صداقت سے انکار کرتے ہیں۔

ہر داعیٔ حق و صداقت کا پیغام، انقلاب آفریں و حریت بخش ہوتا ہے۔ وہ انسانی ذہنوں کے تراشیدہ نظامہائے زندگی کو اُلٹ کر ان کی جگہ فطرت صحیحہ کے مطابق نظام حیات قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس نظام کے تمکن میں ان مترفین کو جو پشتہا پشت سے دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی نرم و نازک زندگی بسر کرتے چلے آتے ہیں، اپنے لئے پیغام موت نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی تن آسانیاں اور سہل انگاریاں انہیں کسی تبدیلیٔ حالات کے قابل نہیں چھوڑتیں۔ اس لئے اُن کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس نہج و اسلوب پر قوم کا نظام معاشرت و تمدن چلا آرہا ہے اُسی پر چلتا جائے۔

وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ ﴿۴۳﴾

اور اس طرح ہم نے (اے رسول عربی) تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا کہ اس کے مترفین گروہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباء و اجداد کو جس روش پر چلتے دیکھا ہے اسی کی تقلید میں ہم نجات و سعادت کی راہ دیکھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

یہی وہ قوم کے اکابر ہیں جو ہر دعوتِ انقلاب کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز اٹھاتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے اپنی ساحرانہ فسوں طرازیوں اور شاطرانہ فریب سازیوں سے قوم کو سکھایا ہی یہ ہوتا ہے کہ تم مرو تاکہ ہم زندہ رہیں، تم کماؤ تاکہ ہم تن آسانی کی زندگی بسر کریں، تم دکھ جھیلو تاکہ ہم سکھ اٹھائیں، تم سنو تو ہمارے کانوں سے، دیکھو تو ہماری آنکھوں سے، سوچو تو ہمارے دماغوں سے، سمجھو تو ہمارے دلوں کی راہ سے۔ چراغ تمہارے ہوں راتیں ہماری۔ زبان تمہاری ہو اور باتیں ہماری۔ تمہارے پسینے سے ہمارے گلستانوں میں آبیاریاں ہوں، اور

تمہارے خون کی رنگینی سے ہمارے ایوانوں میں گلکاریاں۔ اس لئے ہر وہ تبدیلی جس میں سر بجاک غریب کے لئے سامانِ زیست جوان کے لئے پیامِ موت ہوتی ہے۔ لہٰذا اُن کی طرف سے مخالفت یقینی۔ یہی ابد سے ہوتا آرہا ہے، یہی ازل تک ہوتا رہے گا۔ آج سے پانچ ہزار سال پیشتر جب صحنِ زمین میں سب سے پہلی مرتبہ یہ آواز حضرت نوحؑ کی زبان سے اٹھی تو ان ہی اکابر نے اس کی مخالفت کی۔

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (۷/۶۰)

اس کی قوم کے اکابر نے کہا کہ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تو اس دعوتِ انقلاب میں ایک کھلی ہوئی گمراہی پر ہے۔

اور اسی کو جب حضرت ہودؑ نے دُہرایا تو مخالفت کی اس صدائے بازگشت نے اس دعوت کی مزاحمت کی۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ۝ (۷/۶۶)

اس کی قوم کے اکابر نے، جنہوں نے اس دعوت کی صداقت سے انکار کیا تھا، کہا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تو حماقت میں مبتلا ہے اور جو کچھ کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔

اور یہی وہ اکابرینِ قوم تھے جنہوں نے حضرت صالحؑ کی اس پکار کی مخالفت میں آواز اُٹھائی۔

قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ (۷/۷۶)

اس قوم کے مستکبرین نے کہا کہ جس بات پر تم ایمان لائے ہو ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہی جواب حضرت لوطؑ کو ملا۔ (۷/۸۲) اور اسی نہج سے حضرت شعیبؑ کی دعوتِ انقلاب کا استقبال ہوا (۷/۸۸)، یہی وہ اکابر و جابرِ قوم تھے جنہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دینے کی ٹھانی تھی۔ اور یہی قومِ فرعون کے وہ متکبرین و مترفین تھے جنہوں نے فرعون کو حضرت موسیٰؑ کے قتل کرنے کی صلاح دی تھی۔ یہی وہ سیادت و قیادت کے اجارہ دار تھے جنہوں نے جنابِ مسیحؑ کو حوالۂ دار و رسن کرنے کی سازش کی تھی۔ اس لئے کہ وہ خدا کی بادشاہت کو غریبوں کا حصہ بتاتے تھے۔

اور پھر یہی وہ رؤسا و امرائے عرب تھے جنہوں نے تمام عمر اس دعوتِ آسمانی کی سخت ترین مزاحمت و مخالفت کی جو حکومت و سلطنت کی کنجیاں مترفین سے چھین کر متقین کو دینے کے لئے بلند ہوئی تھی۔ یہی ہوتا رہا ہے اور آج بھی یہی ہوگا۔ اس خطۂ زمین پر جسے ہم پاکستان سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب اس انقلاب صحیحہ کی آواز اٹھے گی جو قوم میں صالحیت کا موجب بنے گا اور جس میں عزت و تکریم اور سیادت و امارت کے پیمانے بدل جائیں گے۔ تو اس کی مخالفت میں سب سے پہلی آواز ان ہی مترفین کی طرف سے بلند ہوگی جو آج اپنے خود ساختہ معیاروں کے مطابق از خود واجب الاحترام بنے بیٹھے ہیں اور جن کی کیفیت یہ ہے کہ یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا (۳/۱۸۸)۔ "وہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ وہ محض زبان سے کہتے ہیں لیکن) کرتے نہیں۔ اس کے لئے ان کی تعریف کی جائے" نہیں مستقلاً مسانید عظمت و منابر عقیدت پر بٹھائے رکھا جائے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کی طرف سے اس نظام نو کی طرف دعوت دینے والی ہر آواز کی مخالفت ہوگی۔ چونکہ اس زمانہ کی فضا میں، عہد کہن کے شخصی استبداد کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے سیاست حاضرہ کے تقاضے یہ ہیں کہ زبان سے تغلب و تفوق اور استیلاء و استبداد کی مخالفت کی جائے۔ لیکن نظام اس قسم کا قائم کیا جائے جس میں وہی تغلب و استیلاء موجود ہو۔ یعنی روح وہی ہے لیکن اس کے پیکر بدل چکے ہیں، لات و منات وہی ہیں فقط ان کے لباس میں تبدیلی آگئی ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردے میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن، دولت و حشمت کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ کہتا یہ ہے کہ قوت و دولت کے غلط استعمال سے، (اور ہر اس نظام معاشرت میں جو قرآنی خطوط پر متشکل نہ ہوگا، ان کا استعمال غلط ہوگا) انسانی کردار میں ایسے عیوب و اسقام پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے قرآنی اسلوب و انداز کی زندگی ان پر سخت گراں گذرتی ہے۔ اس لئے مترفین کا گروہ اس انقلاب کی مخالفت و مزاحمت میں ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

لہٰذا، پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے یہ دوسرا مرحلہ، پہلے سے بھی زیادہ ہمت طلب اور حوصلہ آزما ہے۔ اگر انہوں نے اس باب میں جرأت و بسالت اور ثبات و استقامت سے کام نہ لیا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکے گا کہ یہ بھی اسی قسم کی حکومت قائم کر لیں جیسی دنیا کی اور قومیں قائم کئے بیٹھی ہیں۔ لیکن یہ قرآنی استخلاف فی الارض نہیں ہو گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنی حکومت بہر حال و بہر کیف، غیروں کی حکومت کے مقابلہ میں ہزار آئین سودمند ہوتی ہے۔ اس لئے وہ زندگی، اس سے پیشتر کی زندگی سے یقیناً بہتر ہو گی۔ لیکن قرآنی زندگی نہ پہلی تھی، نہ یہ دوسری ہو گی۔ پہلی زندگی میں یہ معذوری تھی کہ ہمیں وہ امکانی مواقع کہاں میسر ہیں کہ ہم اپنے تصورات صحیحہ کے مطابق نظامِ حکومت قائم کر سکیں۔ لیکن اب امکانی قدرت کے میسر آجانے سے وہ بات تو باقی نہیں رہی۔ اب ہمارے پاس اس اعتراض کا کوئی معقول جواب نہ ہو گا کہ ہم نے اپنی زندگی کی عمارت کو قرآنی خطوط پر تعمیر کیوں نہ کیا۔ قرآنی نکتہ نگاہ سے حکومت، مبدل بہ استخلاف و "وراثت" اسی صورت میں ہوتی ہے جب وہ اس نظام کے قیام کا ذریعہ بنے جسے خالقِ کائنات نے نوعِ انسانی کے لئے تجویز کیا ہے اور جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ
وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

یہ (صالحین) وہ لوگ ہیں کہ جب ہم انہیں تمکن فی الارض عطا کریں گے تو وہ نظامِ (۲۲)
صلوٰۃ و زکوٰۃ کو قائم کریں گے، معروف کے احکام نافذ کریں گے اور منہیات سے
روکیں گے۔ اور تمام امور آخر الامر خدا کیلئے ہوں گے۔

نظامِ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر، ایسی محیط کل اور ہمہ گیر اصطلاحات ہیں جن میں سے ہر ایک، اپنی تبئین و تشریح اور تفصیل و توضیح کے لئے مستقل ابواب کی محتاج ہے۔ اس وقت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ قرآنی نظام کی پوری کی پوری بساط حکومت انہی چاروں گوشوں کے اندر سمٹ کر آگئی ہے اور نظامِ صلوٰۃ ان میں عمودی

حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مقام پر قرآن نے نظامِ صلوٰۃ کی اضاعت کو انعاماتِ الٰہیہ کے چھن جانے کا موجب قرار دیا ہے۔ سورہ مریم میں دیکھئے منعم علیہ حضرات (علیہم التحیتہ والسلام) کے تذکارِ جلیلہ کے بعد فرمایا۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝ (۱۹/۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنہوں نے نظامِ صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور اپنی خواہشات ہی کی اتباع کرنے لگ گئے۔ سو وہ ہلاکت و بربادی کو پالیں گے

یہی ہیں وہ جن سے استخلاف فی الارض کی سی نعمتِ عظمیٰ چھن جاتی ہے۔ اور کیسے سوختہ بخت ہیں وہ لوگ جن سے ایسی متاعِ عزیز اس طرح سے چھن جائے۔ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ

یہ ہے صلاحیت پیدا کرنے کا نظام جس کا فطری نتیجہ وراثتِ ارض ہوتا ہے۔ اسے پیشِ نظر رکھئے اور پھر ایک نگاہ اپنے آپ پر ڈالیئے اور ایسا کرتے وقت بنی اسرائیل کی اس واژگوں بخت قوم پر بھی نگاہ رکھئے جس کے مقدرات کے ڈوبتے ہوئے ستارے ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں۔ ان کی یہ حالت تھی کہ ذرا سی تکلیف آئی اور وہ لگے بڑبڑانے۔ کوئی بات خلافِ منشا پیش آگئی اور وہ بیٹھ گئے منہ بسور کر۔ قدم قدم پہ یہ طعن کہ ہمیں خواہ مخواہ مصر سے نکال کر لے آئے۔ اس سے تو ہم قوم فرعون کی غلامی میں اچھے تھے! اور یہاں کیا حالت ہے؟ اگلے دنوں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کالی جھنڈیاں لئے۔ "پاکستان مردہ باد" کے نعرے لگاتے، جلوس کی شکل میں چلے جا رہے ہیں۔ ایک سے پوچھا کہ کیوں؟ کیا بات ہے؟ کہنے لگا۔ میاں! تین دن ہو گئے ہیں پانی کا نل بند پڑا ہے۔ کوئی سنتا ہی نہیں۔ جہنم میں گیا ایسا پاکستان۔ اور بھاڑ میں گئی اسلامی حکومت۔ کچھ وہاں مر گئے۔ جو باقی رہ گئے ہیں یہاں مارے جا رہے ہیں" دیکھئے! یہ داستان

کس طرح حرفاً حرفاً بنی اسرائیل کی داستان سے ملتی ہے اور قوم کس طرح ذرعاً ذرعاً اور شبراً شبراً ان کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ جس شخص سے بات کیجئے ایسا معلوم ہوگا گویا اس نے پاکستان میں آکر کسی کی ہفت پشت مہفتاد نسل پر احسان عظیم کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوم کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ لیکن ان مصیبتوں کی برداشت میں ان کی طرف سے کچھ اس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے گویا یہ مصیبتیں، کسی اور کی خاطر مفت میں جھیل رہے ہیں۔ انہیں قطعاً اس امر کا احساس نہیں کہ انہیں ایک ملک عظیم عطا ہوا ہے تاکہ وہ اس پر اپنی حکومت قائم کریں اور اگر انہوں نے ان مصائب و تکالیف کو ہمت اور حوصلہ سے برداشت کر لیا تو دنیا بھر کی سرفرازیاں اور سربلندیاں اُن کے قدم چومیں گی۔ یہ تو عوام کا حال ہے۔ خواص کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اس خطۂ زمین کے مل جانے سے سب کچھ مل گیا ہے اب کچھ کرنے کا کام باقی نہیں رہا۔ ہندوؤں کی یہ چند روزہ غوغا آرائی ختم ہو جائے تو وہ تخت جہانداری و سریر جہانبانی پر کامل، امن و سکون سے متمکن ہو جائیں گے۔ وَذَالِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد

یاد رکھئے! یہ خطۂ زمین بجائے خویش کوئی شے نہیں۔ نہ یہ اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے اور نہ ہی ہم اس کی مٹی میں دفن ہونے سے جنت الفردوس کے مستحق بن سکتے ہیں۔ یہ محفوظ اسی صورت میں رہ سکتا ہے کہ آپ اپنے خون سے اس کی حفاظت و صیانت کا سامان بہم پہنچائیں، اور پھر اس طرح محفوظ و مصئون ہونے کے بعد یہ جنت ارضی میں اسی صورت میں متبدل ہو سکتا ہے جب آپ اپنے اندر صلاحیت پیدا کر کے اس پر خدا کی حکومت کا تخت اجلال بچھائیں۔ وراثت ارض کا ابدی قانون صلاحیت ہے اور خوف و حزن سے نجات و مصئونیت صرف اس کے لئے مقدر کی گئی ہے جو اپنے آپ کو قانون الٰہیہ کی حفاظت میں لے آئے اور اصلح بن جائے۔

فَمَنِ اتَّقَىٰ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۷/۳۵)

پس جو کوئی اپنے آپ کو قوانین خداوندی کی حفاظت میں لے آئے اور اپنے اندر صلاحیت پیدا کرے
اس کے لئے نہ کوئی خوف ہے نہ غم

وَذَالِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ۔

تقسیمِ ہند کا آئینی پہلو

(قسطِ آخر)

قسطِ اول میں سلسلۂ کلام کا آغاز کرپس مشن (۱۹۴۲ء) سے کیا گیا تھا اور اس میں بتایا گیا تھا کہ برطانیہ نے اس وقت کس طرح پہلی مرتبہ مسلمانوں کے مطالبۂ علیحدگی کو آئینی مذاکرات کا جزو سمجھا اور اسے سیاسی سوداِ بازی سے آگے بڑھا کر عملی سیاست میں باقاعدہ شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد مختلف مراحل طے کرنے کے بعد یہ سلسلہ برطانوی مشن کے اعلان مئی ۱۹۴۶ء کے حصّہ متعلقہ دین آئین تک پہنچا تھا جہاں پر واضح کیا گیا تھا کہ برطانیہ نے کس طرح مسئلہ ہند کے تعطل کو پاکستان کی اساس پر حل کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں ہم یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ مسلم لیگ نے ۶ جون کو ۱۶ مئی کا اعلان وائسرائے اور مشن کی اس ضمانت پر منظور کر لیا کہ اگر کانگریس نے اس مرتبہ تجاویز مسترد کر دیں تو مسلم لیگ کے تعاون کا فائدہ اٹھایا جائے گا اور وائسرائے مسلم لیگ کی مدد سے عارضی حکومت کی تشکیل کر لیں گے۔

قسطِ زیرِ نظر میں، جو اس مضمون کی آخری قسط ہے، اعلان جون کے حصّہ متعلقہ تشکیل حکومت عبوری اور کو الف مابعد بشمول اعلان پاکستان (۳ جون ۱۹۴۷ء) تک کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سے پاکستان کے پس منظر کی تکمیل ہو جاتی ہے اور اس کے حال اور مستقبل سے متعلق آئینی مسائل کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

---

۱۶ مئی کے وزارتی بیان کے شائع ہوتے ہی وائسرائے نے عارضی مرکزی حکومت کی تشکیل کے لئے قائدینِ لیگ و کانگریس سے مذاکرت و مراسلت شروع کر دی تھی۔ کوئی مفاہمت نہ ہونے کی صورت میں اس کے متعلق بھی وائسرائے کو اپنی تجویز پیش کرنا پڑی۔ تجویز مختصراً یہ تھی۔ وائسرائے نے چودہ اصحاب کو دعوت دی کہ وہ عارضی مرکزی حکومت میں شریک ہوں۔ ان کا تناسب یوں تھا، مسلمان پانچ، اسورن [illegible] ہندو پانچ،

سکھ ایک، اچھوت ایک، پارسی ایک، عیسائی ایک۔ مدعوین کے نام وائسرائے نے خود ہی منتخب کئے تھے۔

ناموں کے اعلان کے بعد اعلان میں تھا کہ

اگر یہ اصحاب ذاتی وجوہات کی بنا پر دعوت قبول کرنے سے قاصر ہوں تو وائسرائے مشورہ کے بعد دوسرے حضرات کو ان کی بجائے دعوت دیں گے۔

شعبوں کی تقسیم کا کام وائسرائے دونوں پارٹیوں کے لیڈروں کے مشورہ سے کریں گے۔

عارضی حکومت کی مجوزہ ترکیب فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے مثال نہیں ہوگی۔ یہ ترکیب محض موجودہ مشکل کا حل اور بہترین امکانی مخلوط حکومت ہے۔

اگر دونوں پارٹیاں یا ان میں سے کوئی ایک پارٹی اس تجویز کے مطابق مخلوط حکومت کی تشکیل میں شرکت پر رضامند نہ ہوں، تو وائسرائے کا ارادہ ہے کہ وہ عبوری حکومت کی تشکیل کا کام جاری رکھیں گے اور ان کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی حاصل کریں گے جو ۱۶ رمئی کے اعلان کو قبول کرتے ہیں۔

مسلم لیگ کا مطالبہ مساوات نیابت یہ تھا کہ کانگریس اور لیگ کے نمائندے مساوی ہوں۔ یہ شرط وائسرائے نے قبول کرلی تھی اور ۱۶ رجون کے اعلان سے پیشتر ایک ملاقات میں قائدِ اعظم سے عہد کرچکے تھے کہ عبوری حکومت بارہ ارکان پر مشتمل ہوگی اور ان کی ترکیب یوں ہوگی۔ مسلم لیگ پانچ، کانگریس پانچ، سکھ ایک، عیسائی (یا اینگلو انڈین) ایک۔ شملہ کا یہ عہد وائسرائے نے اس وقت بھی دہرایا جبکہ ۵ رجون کو دہلی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس بدیں مقصد منعقد ہو رہا تھا کہ ۱۶ رمئی کے بیان کے متعلق اپنی روش متعین کرے۔ قائدِ اعظم نے ۱۹ رجون کو وائسرائے کو جو خط بھیجا اس میں صاف طور پر لکھا کہ وائسرائے کے اس عہد اور اس کے اعادہ نے مسلم لیگ کونسل کے فیصلہ قبولیت کو خاص طور پر متاثر کیا۔ بظاہر وائسرائے اس فیصلہ پر مستحکم نظر آتے تھے لیکن ۱۲ رجون کی ملاقات میں آپ نے قائدِ اعظم سے یہ اظہار کیا کہ وہ بارہ کی بجائے تیرہ ارکان کو شریکِ حکومت کریں گے۔ ایک کا اضافہ ایک اچھوت رکن سے ہوگا۔ ۱۳ رجون کو یہ بات ہوئی اور ۱۶ رجون کو وائسرائے نے جو اعلان کیا اس میں ایک اور رکن کا اضافہ ہوگیا اور مجموعی تعداد ارکان تیرہ سے بڑھ کر چودہ ہوگئی۔ اس نئے فارمولا میں مسلم لیگ اور کانگریس کی مساوات نیابت ختم کردی گئی اور مساوات مسلمانوں اور سورن ہندوؤں میں قائم کردی گئی۔ اس نام نہاد مساوات کی

حقیقت یہ تھی کہ پانچ مسلم لیگیوں کے مقابلہ میں چھ کانگرسی آ گئے۔ تین اقلیتی نمایندے مسلم لیگ کی قوتِ رائے گھٹانے کے لئے اور بٹھا دیئے گئے۔ لارڈ ویول ——— یا نام کی بجائے ہم وائسرائے کہیں ——— اور برطانوی وفد نے یہ پہلی اعلانیہ بدعہدی کی۔ ایک بدعہدی جس میں شملہ کے وعدہ اور اس کے اعادہ دہلی کی دوسری مخالفت ہوئی۔ بارہ ارکان کی تعداد غلط، تیرہ کی غلط ——— آخر کار صحیح تعداد چودہ نکلی جو مسلم لیگ کے علم اور مشورہ کے بغیر طے پائی۔ اسی بدعہدی میں وائسرائے پیش رو تھے اور وزارتی مشن ان کے مؤید۔ ۱۶ رمئی کو برطانوی اعلان شائع ہوا۔ ۱۶ رجون کو یعنی پورے ایک ماہ بعد عبوری حکومت سے متعلق وائسرائے کا اعلان ہوا۔ اس ایک تاریخی مہینے میں کانگرس نے جو کچھ کیا اس کا ملکا سا خاکہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ اس نے ۱۶ رمئی کے اعلان کے متعلق اپنی روش واضح نہیں کی۔ نہ اسے قبول کیا، نہ مسترد کیا۔ بس وہ یہی تاریں ملاتی رہی کہ مسلم لیگ کو کسی طریقے شکست دی جائے۔ اس نے بات بات پر پہلو بدلے اور فیصلہ کو ٹالا۔ چنانچہ ۳۰ مئی تک کانگرس کے فیصلہ کا بے سود انتظار کرکے وائسرائے نے صدر کانگرس کو لکھا کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۵ تاریخ کو منعقد ہو رہا ہے اگر آپ بھی ۷ تاریخ کو اپنی مجلسِ عاملہ کو مجتمع کرکے آخری فیصلہ کر دیں تو آئندہ ہفتہ کے دوران میں متنازع فیہ مسائل کا حل ہو جائے۔ مسلم لیگ نے ۶ تاریخ کو اپنا فیصلہ بھی دیدیا اور کانگرس سازشوں میں مصروف رہی۔ ۲۰ رجون کو یعنی ۱۶ رجون کے اعلان کی اشاعت کے بعد وائسرائے نے صدر کانگرس کو لکھا کہ

> مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس حقیقت کا کا حقہ احساس ہوگا کہ وزارتی مشن کو انگلستان جا کر بہت سے ضروری امور سر انجام دینے ہیں اور وہ زیادہ دیر تک یہاں انتظار نہیں کر سکتے۔ لہٰذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجلسِ عاملہ سے کہئے کہ وہ ۱۶ رجون کے اعلان سے متعلق اپنا فیصلہ جلد از جلد صادر کر دے۔

اس کے علاوہ وائسرائے نے متعدد مرتبہ زبانی یاددہانی کرائی۔ لیکن کانگرس، اقوامِ ہند کی اجارہ دار کانگرس نے پورے انتالیس دن محض باتوں ہی میں گزار دیئے۔ ایک ایسا معاملہ جو ہندوستان کے آئندہ آئین سے متعلق تھا اور جس سے چالیس کروڑ انسانوں یعنی کرۂ ارض کے پانچویں حصہ آبادی کی قسمت وابستہ تھی، اس معاملہ میں کانگرس کی سنجیدگی اور تفکر کا یہ حال تھا کہ لاطائل دلیلوں اور رکیک موشگافیوں میں انتالیس دن گزار دیئے ادھر یہ کھچڑی پک رہی تھی اور ہر باورچی اپنے اپنے فن کا حتی المقدور مظاہرہ کر رہا تھا ادھر موجودہ ہندوستان کے

وزیرِ اعظم، پنڈت نہرو، کانگرس کے لاڈلے مگر بگڑے فرزند آئینی مذاکرات اور فیصلے ادھورے چھوڑ کر دہلی سے کشمیر پہنچ گئے کہ مہاراجہ سے یہ حق منوائیں کہ پنڈت صاحب کشمیر میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اوچھے اور طفلانہ مظاہرں سے اپنی عزت افزائی کرا کے پنڈت جی خیر سے گھر کو آئے اور تصفیہ کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع کیا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

کانگرس نے ۲۵ جون کو بالآخر اپنا فیصلہ دے ہی دیا۔ ۱۶ مئی کا اعلان جو آئندہ آئین سے متعلق تھا اسے کانگرس نے اپنی توجیہوں کے ساتھ منظور کیا اور ۱۶ جون کا عبوری دور سے متعلق اعلان مسترد کر دیا۔ یہ منظوری لفظاً منظوری تھی اور معناً نامنظوری، صوبائی تحزب جسے مشن، یعنی واضعین اعلان، جبری قرار دیتے تھے اسے کانگرس نے اختیاری قرار دیا اور اس توجیہ کے ساتھ اعلان مذکور قبول کر لیا۔ یہ توجیہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے غلط تھی، تحزب جبری تھا اور یہ تجویز کا اہم جزو تھا۔ اسے تنہا کانگرس بدل نہیں سکتی تھی۔ اس کے بدلنے کے لئے مسلمان ارکان کی بھی اکثریت درکار تھی۔ لیکن کانگرس نے مجلس دستور ساز کے انعقاد کا انتظار کیا، نہ مسلمانوں کی رضامندی حاصل کی۔ مشن جو کانگرس سے ملی بھگت کر چکا تھا اس نے اس کاغذی منظوری کو بھی شرف قبول بخشا۔ وہ تین مہینے سے ان مذاکرات میں الجھا ہوا تھا اور کامیابی گریز پا تھی۔ اسے انگلستان میں مخالف پارٹی کے سامنے بھی تو اپنی کارگذاری پیش کرنا تھی۔ مسلم لیگ دونوں اعلانات، متعلقہ آئندہ آئین و دورِ عبوری، تسلیم کر چکی تھی۔ کانگرس نے عبوری دور کی تجویز علانیہ مسترد کر دی تھی لیکن آئندہ آئین سے متعلق تجویز کو لفظی طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ برطانوی وفد اس نام نہاد منظوری کو دنیا بھر میں بالعموم اور انگلستان میں بالخصوص فخریہ پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس بے حقیقت کارگذاری کا ڈھول پیٹنا چاہتا تھا کہ شدید و بنیادی اختلافات کے باوصف وہ مسلم لیگ اور کانگرس کو یہاں تک قریب لے آیا کہ دونوں نے ۱۶ مئی کا اعلان قبول کر لیا۔ گویا مجلس دستور ساز کی تشکیل و کارکردگی پر دونوں پارٹیاں متفق ہو گئیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ برطانوی وزراء نے اپنی غلط توقیر قائم رکھنے کے لئے دلیری، صاف گوئی اور دیانت سے کام نہیں لیا۔ وہ آہستہ آہستہ کانگرس کے سامنے جھکتے گئے جھکتے گئے تا آنکہ کانگرس ان کی پشت پر سوار ہو گئی۔ اگر وہ شروع سے کانگرس کو دلیرانہ جواب دیتے اور اسے ان حدود میں رکھتے جو انھوں نے متعین کی تھیں تو معاملات بلا تضیع اوقات اور بطریق احسن سطے

پا جاتے اور یہ بظاہر لاینحل مسئلہ کب کا حل ہو چکا ہوتا۔

مسلم لیگ اور کانگریس کے فیصلے معلوم ہو جانے پر لازماً سوال پیدا ہوتا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔ مسلم لیگ نے آئندہ آئین اور عبوری دور سے متعلق تجاویز کو قبول کر لیا تھا۔ اس کے برعکس کانگریس نے بال کی کھال اتار اتار کر جو فیصلہ شائع کیا وہ اسی غیر مصالحانہ اور تخریبی ذہنیت کا آئینہ دار تھی جس کا مظاہرہ تقدیرِ ہند کے ان اہم فیصلہ کن دنوں میں اس نے بغایت اخری کیا تھا۔ اس نے ۱۶ رمئی کا بیان اپنی توجیہوں کے ساتھ (نا) منظور کیا اور ۱۶ رجون کا بیان نامنظور۔ وائسرائے اور مشن جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے اپنی ناکامی کا اتنا احساس رکھتے تھے کہ وہ اضطراراً تنکوں کا سہارا لے رہے تھے۔ کانگریس کی مشتہر منظوری ایسا ہی سہارا تھی۔ یہ وقت تھا کہ مشن کانگریس سے واضح جواب طلب کرتا اور ان سے مطالبہ کرتا کہ وہ یا تو غیر مبہم طور پر ۱۶ رمئی کے بیان کو تسلیم کریں یا مسترد کریں۔ مشن نے کانگریس کی اس منافقانہ رضامندی کو قبول کر لیا اور کانگریس نے مشن کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ اگر اس وقت کانگریس کو غیر مبہم جواب دینے پر مجبور کیا جاتا تو بیشتر سیاسی فتنے ابدی نیند سو جاتے۔ بہرکیف مشن نے اسے منظوری فرض کرتے ہوئے آگے چلنا چاہا۔

کانگریس ۱۶ رجون کا اعلان مسترد کر کے عبوری حکومت میں شرکت کی مستحق نہیں رہی تھی۔ وائسرائے نے مشن کی اجازت اور تائید سے مسلم لیگ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر کانگریس عبوری حکومت میں شریک نہ ہوئی، تو حکومت کی تشکیل و ترتیب ان عناصر سے کی جائے گی جو ۱۶ رجون کے اعلان میں بیان کردہ خطوط و شرائط پر حکومت میں آنا پسند کریں گے۔ ۱۶ رجون کے اعلان کا مشہور پیرا جس کی متضاد و غیر معقول توجیہوں نے عام طوفان پیدا کر دیا مندرجہ ذیل ہے۔

> دونوں پارٹیوں یا ان میں سے کسی ایک کے ان خطوط پر مخلوط حکومت کی تشکیل پر رضامند نہ ہونے کی صورت میں وائسرائے کا ارادہ ہے کہ وہ ایسی عارضی حکومت کی تشکیل کا کام جاری رکھیں جو ان کی زیادہ سے زیادہ نمائندہ ہو جو ۱۶ رمئی کا اعلان قبول کرتے ہیں۔

ان الفاظ کا مفہوم بالکل عیاں ہے۔ ان میں کوئی ابہام نہیں۔ ان الفاظ کو ان ضمانتوں سے ملا کر پڑھا جائے جو وائسرائے نے وقتاً فوقتاً مسلم لیگ کے صدر کو دیں تو یہ مفہوم اشتباہ اور ابہام سے یکسر پاک ہو جاتا ہے

اس پیرے کا مطلب اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو ان ضمانتوں اور تسلیوں کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ کیا پیرا ۸ کے مصنفین کے ذہن میں غیر صلح جو "ایک پارٹی" مسلم لیگ تھی اور وہ اسی کی متوقع نارضامندی کا سدِ باب کرنا چاہتے تھے؟ اتنے عظیم اور تقدیر انگیز مذاکرات سے متعلق اس قسم کا سوال بداہتاً ناقابلِ اعتنا اور بازاری سا معلوم ہوتا ہے لیکن مخصوص پس منظر میں یہ ایک سنجیدہ سوال بن گیا۔ جس کا صرف مثبت جواب دیا جاسکتا تھا۔

بہرکیف مشن اور وائسرائے آگے بڑھے۔ عبوری حکومت کے لئے وہ کانگرس کا تعاون حاصل نہیں کرسکتے تھے اور ان کی بے تدبیری نے دوسری اہم سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ کا یقینی تعاون کھو دیا۔ محکم و ناقابلِ تردید مواعید کے باوجود ملک معظم کا نمائندہ ہند وہ فوجی وائسرائے جس کی عسکری تربیت اعلیٰ سیرت اور خوش معاملگی کی ذمہ دار سمجھی جاتی تھی، صاف انکاری ہوگیا۔ وائسرائے کی وعدہ خلافی کو ملک معظم کی حکومت کے وزیروں اور جمہوریت کی گہوارہ اولین برطانوی پارلیمان کے نمائندوں نے حق بجانب قرار دیا پاس عہد اور اخلاقی ذمہ داری کو بالائے طاق رکھ دینے میں ان مدعیانِ حق و صداقت . . . .

اور واضعین تقدیر ہند کی ضمیر مردہ نے ذرہ بھر ملامت نہ کی۔ عین اس حال میں کہ دنیا بھر کی نظر میں اس بدقسمت برصغیر اور وزرائے ملک معظم کی مساعی مصالحت پر لگی ہوئی تھیں اور برطانیہ اپنی بے غرضی، خلوص اور فرض شناسی کا یقین دلا رہا تھا یہ اخلاقی حادثہ پیش آیا۔ بہی خواہانِ ہند اس سیاسی فریب کاری اور دھوکہ بازی پر دم بخود تھے۔ ایک مسلم لیگ کو کاروبار حکومت سے بہرہ مند نہ کرنے کے خیال سے اخلاق، آئین اور قانون کے ابتدائی ضابطے سربائے استغنا سے ٹھکرا دیئے گئے۔ مانا کہ کانگرس کا عبوری حکومت میں شریک نہ کرنا وقتی مصالح کے خلاف تھا اور مسلم لیگ کو مرکز پر مسلط کردینا وقتی مصالح کے اور زیادہ خلاف۔ لیکن آئین و اخلاق کے مستقل تقاضے وقتی تقاضوں اور سیاسی مصلحتوں سے کہیں زیادہ قابلِ قدر اور گراں بہا ہوتے ہیں۔

زیر نظر پیرا ۸ میں تحریر تھا کہ اگر ایک پارٹی یا دونوں پارٹیاں عبوری حکومت کی مجوزہ تجویز (یعنی ۱۶ جون کے اعلان) سے متفق نہ ہوئے تو تشکیل حکومت اس انداز سے کی جائے گی کہ وہ ان کی زیادہ سے زیادہ نمائندہ ہو جو ۱۶ مئی کا اعلان قبول کرتے ہیں۔ ۱۶ مئی کا اعلان لیگ نے اور (لفظی طور پر) کانگرس نے تسلیم کر لیا تھا۔ جون کا بیان محض مسلم لیگ نے منظور کیا۔ اب تشکیلِ حکومت دو نو پارٹیوں سے مل کر ہوسکتی تھی کیونکہ دونوں نے مئی کا اعلان

قبول کر لیا تھا لیکن چونکہ کانگرس نے جون کا اعلان مسترد کر دیا تھا اور یہی اعلان عبوری حکومت سے متعلق تھا اس لئے اس کے عبوری حکومت میں شریک ہونے یا شریک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسے میں تشکیلِ حکومت میں مسلم لیگ اور وہ عناصر آ سکتے تھے جو مئی کا اعلان قبول کرتے تھے۔ کانگرس خارج از بحث تھی۔

کیا مسلم لیگ کو پھانسنے کے لئے یہ چکمہ دیا گیا تھا؟ کیا اس گمراہ کن بیرے اور اس کی منافقانہ تشریح کی تصنیف اس لئے ہوئی تھی کہ مسلم لیگ کو سبز باغ دکھا کر اور مغالطہ میں ڈال کر اعلانات زیرِ نظر پر عمل پیرا کرایا جائے ۔ ۲۷ر جولائی کو بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے فرمایا۔

> ۲۴ر جون کی رات کو کانگرس نے عبوری دور اور آئندہ آئین سے متعلق تجاویز کو یک قلم مسترد کر دیا تھا مگر ۲۵ کی صبح کو انتھک سر سٹیفورڈ کرپس بھنگی بستی گئے اور مسٹر گاندھی کو جگایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ لارڈ پیتھک لارنس کو مسٹر پٹیل کے سراغ پر چھوڑا گیا۔ وہ انھیں سڑک پر سے اچک کر گھر لے گئے اور وہاں منصوبہ تیار کیا۔ کانگرس کو آئندہ آئین سے متعلق تجویز منظور کر لینے کی ترغیب دی گئی۔ خواہ وہ اپنی توجیہوں کے ساتھ ہی ایسا کیوں نہ کرے۔ مشن نے کانگرس کو یقین دلایا کہ وہ عبوری حکومت کی تجویز ترک کر دے گا۔

اس فردِ جرم کی کوئی تردید نہیں کر سکا۔ در پردہ گھناؤنی سازشوں کا یہ ایک ضمنی گوشہ ہے۔ سراپردہ سیاست کے اسرار مستقل داستان ہیں! حیرت آفریں!! نفرت انگیز!!!

جب مسلم لیگ اور کانگرس دونوں اعلانات پر غور کر رہی تھیں اور خدشہ تھا کہ وہ فیصلے کرنے میں غیر ضروری تاخیر نہ کر دیں تو اس وقت انھیں زائدگان جنگ انتظامی مصائب کی دہائی دی جاتی تھی اور اس نیم قحط کا واسطہ دیا جاتا تھا جو ملک میں اشیائے خوراک کی کمیابی اور گرانی سے وقوع پذیر تھا۔ ایک کانگرس کے انکار شرکت نے جملہ اشد مسائل کو بے حقیقت بنا دیا۔ وہ عجلت کے استدلالات سب دھرے رہ گئے اور ہوا تو یہ کہ گذشتہ تین مہینوں کی لگاتار محنت سے وائسرائے اور سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں پر جو بارِ گراں پڑا ہے اس کے پیشِ نظر مزید مذاکرات کچھ وقت کے لئے ملتوی کئے جاتے ہیں۔ ۲۶ر جون کو مزید مضمون وائسرائے نے اعلان کیا

اور تین دنوں کے بعد وائسرائے انگلستان عازمِ انگلستان ہو گئے۔ مذاکرات کے از سرِ نو شروع ہونے تک ایک نگراں (Caretaker) حکومت کا اعلان کر دیا گیا جو سراسر سرکاری حضرات (officials) سے مرکب تھی۔ یہ اقدام سراسر ناقابلِ فہم تھا۔ نام نہاد نگرانِ حکومت نے اس مجلسِ منتظمہ کو بھی ختم کر دیا جس کے ارکان ایوانِ حکومت سے باہر ایک حد تک قدر و منزلت سے دیکھے جاتے تھے اور وہ کسی حد تک بعض طبقات کے "غیر منتخب" نمائندے بھی تھے۔ لیکن ان کو جواب دے کر ایک ایسی 'حکومت' مرتب کر دی گئی جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور جو سوائے حکومت کے کسی کی نمائندہ نہ تھی۔ یہ غیر ذمہ دار اور خلافِ آئین حکومت اپنی ترکیب کے لحاظ سے ہی اہم مسائل کو نپٹا سکنے کی اہل نہ تھی۔ وہ قانونی اعتبار سے اس کی مجاز بھی نہ تھی۔ کاروبارِ حکومت کو یوں معطل کر دینے کی مصلحت کچھ ہندوستان کا فیلڈ مارشل وائسرائے ہی سمجھ سکا ہو گا!

تمام مسائلِ مہمہ کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا کر وائسرائے آرام گاہ میں تشریف لے گئے۔ استراحت فرمانے کے بعد آپ نے

دوزخ میں ڈالدے کوئی لیکر بہشت کو

کے مصداق "سنا اور دیکھا نہ تاؤ" عارضی حکومت کا اہتمام و انصرام تنہا پنڈت نہرو کے سپرد کر دیا۔ اس دورانِ استراحت میں مسلم لیگ اور مسلمان غم و غصہ سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ان کی عزتِ قومی کو پامال کیا گیا تھا اور ان کے تعاون واشتراک کا عملی استخفاف کیا گیا تھا۔ ہمہ گیر مطالبہ کے پیشِ نظر مسلم لیگ کونسل کا اجلاسِ بمبئی (۲۷-۲۹ جولائی) دہلی کی قرارداد رضامندی واپس کر چکا تھا اور آئینی جد و جہد کو بے اثر دیکھ کر عہد کر چکا تھا کہ ضرورت آپڑی تو مسلم لیگ تصادم (براہِ راست اقدام) سے گریز نہیں کرے گی۔

ادھر مسلم لیگ دل برداشتگی کے عالم میں بمبئی میں کونسل کے انعقاد کی تیاریوں میں مصروف تھی کہ وائسرائے کی بدعہدی اور مشن کے توہین آمیز رویہ کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے فیصلہ دہلی پر نظرِ ثانی کرے، اُدھر ایوان ہائے حکومت اور کانگریس حلقوں میں سیاسی سازش بھرے انگڑائیاں لے رہی تھی۔ لیگ کے فیصلہ بمبئی نے راستہ صاف کر دیا۔ چونکہ مسلم لیگ نے اپنی قبولیت منسوخ کر دی تھی اس لئے وہ عبوری حکومت میں شرکت کی مستحق نہیں رہی تھی۔ اب اس کا استحقاق صرف کانگریس ہی کو حاصل تھا جو اپنے نقطۂ نگاہ سے

۱۶ مئی کے بیان کو مان رہی تھی۔ لہٰذا وائسرائے نے ایک اور حیرت زا اقدام کیا۔ انھوں نے پنڈت نہرو کو بحیثیت صدر کانگریس دعوت دی کہ وہ عبوری حکومت کی تشکیل کا اہتمام اپنے ذمہ لیں۔ پنڈت جی خوشی سے پھولے نہ سمائے کیونکہ اب صورت یہ نہیں تھی کہ وائسرائے ان کی فہرست اسماء سے انتخاب کرتا بلکہ اب ترتیبِ حکومت کی ساری ذمہ داری صدر کانگریس کی تھی۔ جو جز ۱۹۳۶ء میں مانگی گئی تھی وہ لباسِ حقیقت اختیار کر رہی تھی۔ اور جو خواب گذشتہ دس سال سے دیکھا جا رہا تھا اور جسے عالم بیداری میں دیکھنے کے لئے راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی وہ آج متشکل ہو رہا تھا۔

جنگ کے دوران میں کانگریس نے برطانیہ کا یہ جواب کبھی تسلیم نہیں کیا کہ زمانہ جنگ اہم آئینی تبدیلیوں کے لئے موزوں نہیں۔ بلکہ وہ اسی ضد پر قائم رہی کہ اگر ان کا مطالبہ تسلیم کرنے کی یہی صورت ہے کہ آئین بنیادی طور پر بدل دیا جائے تو ایسا کر لینا چاہیے۔ لیکن یہی کانگریس اس جدوجہد کے باوجود اب اس مرکزی حکومت کی قیادت وعنان سنبھال رہی تھی جو ۱۹۳۵ء کے نہیں بلکہ ۱۹۱۹ء کے قانونِ اصلاحات کے تحت عمل میں آئی تھی۔ کانگریس نے اس "قبل از نوح" قسم کے دستور کو چلانا اسی لئے گوارا کر لیا کہ اب وہ مسلم لیگ کے بغیر حکومت مرتب کر رہی تھی۔ ابتدائے جنگ سے لے کر اب تک اس نے اصرار و تکرار سے مرکزی حکومت میں آنے سے انکار کیا وہ کسی نہ کسی بہانے سے اس ذمہ داری سے گریز ہی کرتی رہی۔ شاید اس لئے کہ وہ اس سے پیشتر مسلم لیگ کو الگ کر کے تنہا حکومت کی ذمہ داری نہیں لے سکتی تھی۔ آج جب اسے مسلم لیگ کے بغیر تشکیلِ حکومت کا موقع ملا تو اس نے تمام آئینی بحثیں اور قانونی حجتیں ختم کر ڈالیں اور بلا شرط عنانِ حکومت سنبھال لی۔ بعد کے واقعات نے اس قیاس کو ظنی نہیں رہنے دیا۔ کیونکہ جب بعد میں مسلم لیگ شریک ہو گئی تو طفلانہ وجوہات پر کانگریس نے استعفا دینے کے رعب دیئے اور نہایت سنجیدگی سے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلم لیگ کو عارضی حکومت سے خارج کر دے۔

وائسرائے نے تنہا کانگریس کو دعوتِ تشکیل و ترتیبِ حکومت دے کر غیر ذمہ داری اور جانبداری کا افسوسناک مظاہرہ کیا۔ جون کے آخر میں بعینہٖ یہی پوزیشن تھی۔ البتہ اس وقت فرق یہ تھا کہ کانگریس آمادہ بہ تعاون نہ تھی۔ اب کانگریس کی بجائے مسلم لیگ کنارہ کش تھی۔ جو ذمہ داری ایک ماہ پیشتر تنہا لیگ کو نہیں دی جا سکتی تھی وہ آج تنہا کانگریس کو دی جا رہی تھی اور پوری ڈھٹائی اور بد سلیقگی کے ساتھ۔ مسلم لیگ کی قرارداد تصادم (یا براہِ راست اقدام) بالذات انکار نہ تھی۔ وہ نتیجہ تھی اس تسلسلِ واقعات کا کہ وائسرائے اور کانگریس جس کی کڑیاں تھے۔ ان واقعات سے

تانے بانے میں تینوں فریق شریک تھے۔ اس لئے کسی مقام پر پہنچ کر کسی ایک فریق کے اعمال واقوال کو سارے پس منظر سے جدا کر کے اس پر تنقید کرنا اور اسے تنہا مجرم گردانا خلاف دانش تھا۔ مسلم لیگ کی ناراضی متعلقہ تجاویز سے نہیں تھی بلکہ اس سلوک ناروا کے باعث تھی جو وائسرائے اور کانگرس نے روا رکھا۔ مسلم لیگ جن تجاویز کو دہلی میں صحیح یا غلط طور پر تسلیم کر چکی تھی انہی تجاویز کو یونہی مسترد کرنا کہاں کی دانشمندی تھی۔ ان تجاویز میں تو کچھ ردوبدل نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا احتجاج کہ مسلم لیگ وائسرائے اور کانگرس کی ملی بھگت کے خلاف احتجاج کر رہی تھی اور بس۔ ضمناً ہم سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ نے ازرہِ امن پسندی اور حفاظت جوئی دہلی میں تجاویز منظور کرنے میں عجلت سے کام لیا۔ اس کا معتدبہ طبقہ استرداد کے حق میں تھا۔ قدم اول پر ہی اگر ان تجاویز کا تجزیہ کر کے اور مالۂ و ماعلیہ پر بحث کر کے مناسب تحفظات کا مطالبہ کیا جاتا (کانگرس کی طرح ؟) مشروط قبولیت روا رکھی جاتی تو انسب تھا۔ کیونکہ اس صورت میں بمبئی میں فیصلہ منسوخ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی بلکہ انہی شرائط کو دہرا کر اپنے اصلی مطالبہ اور فیصلہ پر قائم رہا جا سکتا تھا۔ اگر مسلم لیگ یہ روش اختیار کرتی تو ایک تو کانگرس کی منافقت کا مناسب جواب ہوتا دوسرے بمبئی کے فیصلہ تنسیخ کے بعد وائسرائے کے ہاتھ میں یہ حربہ ہرگز نہ آتا کہ چونکہ مسلم لیگ نے ۱۶ مئی کا اعلان نامنظور کر دیا ہے اس لئے اب اسے شرکت حکومت کی دعوت نہیں دی جا سکتی۔ اس مسلسل مشروط رضامندی سے یا تو لیگ اور کانگرس دونوں مستحق حکومت ہوتیں یا دونوں "راندہ" متصور کی جاتیں۔ کم از کم وائسرائے، کانگرس سے کوئی امتیازی سلوک کرنے کا بہانہ نہ تلاش کر سکتے۔

پنڈت نہرو نے متکبرانہ انداز سے قائداعظم کو دعوت دی کہ وہ ترتیب حکومت میں ان سے تعاون کریں قائداعظم نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا۔ نہرو یہ دعوت دینے والے کون ؟ چنانچہ کانگرس نے ایک عبوری مرکزی حکومت زیرِ سرکردگی پنڈت نہرو مرتب کی جو ۲ ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء کو برصغیر ہند پر مسلط ہو گئی۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ یوم سیاہ تھا۔ ترہین ایام سیاہ گزرنے پائے تھے کہ مسلم لیگ نے وائسرائے کی دعوت پر کانگرس سے سمجھوتہ کئے بغیر اپنے پانچ نمائندے مرکزی حکومت میں بھیج دیئے۔ یہ شرکت عبوری دور کی تجویز مسترد کر دینے کے باوجود ہوئی ۔۔ کانگرس نے وائسرائے کی مجلسِ منتظمہ میں آ کر جو مسلم کش حکمتِ عملی روا رکھی اس کے پیش نظر یہ ضروری ہو گیا کہ حقوق کے تحفظ اور کانگرسی ریشہ دوانیوں کے سدباب کے لئے حکومت میں اپنے نگہبان مقرر کئے جائیں۔ اس

فیصلہ سے مرکزی حکومت دو احزاب میں بٹ گئی۔ ایک حزب کانگریس تھا اور دوسرا حزب مسلم لیگ۔ آئینی تاریخ میں یہ دو قومی، اور غیر مخلوط، وزارت اپنی مثال نہیں رکھتی۔ اس عجوبہ وزارت نے اندرون و بیرون حکومت کیسے کام چلایا؟ یہ داستان دلچسپ ہے مگر ہمارے موضوع سے خارج۔

عارضی حکومت کے بن جانے سے نگاہیں پھر آئندہ آئین کی تدوین پر مرکوز ہو گئیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں مفاہمت کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ اگر دونوں جماعتیں حکومت میں شریک ہو جائیں تو باہمی تعاون سے ان کے اختلافات کم ہو جائیں گے اور وہ ایک دوسرے سے تعاون کرنا سیکھ جائیں گی لیکن ایوانِ حکومت میں یکجا ہو کر وہ ایک دوسرے سے اور دور ہو گئیں اور آئندہ آئین کا مسئلہ پھر لاینحل نظر آنے لگا۔ اس اثنا میں قائد اعظم نے اس رائے کا اظہار کیا کہ سارے معاملہ پر از سرِ نو غور کیا جائے اور لندن میں نئی کانفرنسوں کا آغاز کر کے معاملہ سلجھایا جائے۔ انھوں نے مزید کہا کہ وائسرائے نے جو کچھ کیا اس کے پیش نظر وہ محض اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی خاطر لندن جانے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ اگر برطانوی حکومت از سرِ نو گفتگو کے لئے مجھے دیگر فریقین کے ہمراہ لندن آنے کی دعوت دے تو میں منظور کر لوں گا۔ اس تجویز کا خاطر خواہ اثر ہوا اور لندن میں کانفرنس کا آغاز کر دیا گیا جس میں قائد اعظم، لیاقت علی خاں، پنڈت نہرو اور بلدیو سنگھ شریک ہوئے۔

مرکزی حکومت میں آ کر کانگریس نے مجلس دستور ساز کے انعقاد کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ مسلم لیگ اپنے فیصلہ پر قائم تھی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ بحالاتِ موجودہ مجلسِ مذکورہ میں شرکت کے لئے تیار نہیں۔ ۱۶ مئی کے اعلان کے مطابق مسلم لیگ کے بغیر مجلسِ دستور ساز کے انعقاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا مگر کانگریس اپنی ضد پر قائم تھی اور انگریز اس کی پشت پر تھا۔ مجلس کا انعقاد کانگریس کے نزدیک وقار کا سوال بن گیا تھا۔ وہ اس انعقاد کو اپنی فتح اور لیگ کی شکست متصور کرتی تھی۔

یہ تیاریاں ہو رہی تھیں کہ لندن سے دعوت آئی۔ کانگریس اس اثنا میں اعلان کر چکی تھی کہ (بریدہ اور غیر آئینی) مجلس دستور ساز ۹ دسمبر کو منعقد ہو گی۔ لندن کانفرنس کی نوعیت اور معاملہ کی غیر معمولی نزاکت کے پیشِ نظر اس مجلس کا انعقاد چند دنوں کے لئے ملتوی بھی کیا جا سکتا تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پنڈت نہرو اس میں اس وقت شریک ہوں جب لندنی کانفرنس کسی ایک فیصلہ پر پہنچ جاتے۔ لیکن وہ کانفرنسوں سے دامن چھڑا کر ۹ دسمبر سے پہلے دہلی پہنچ گئے۔

انگلستانی مذاکرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک معظم کی حکومت نے فیصلہ دیدیا کہ مسلم لیگ کا نظریہ صحیح تھا اور کانگریس کا غلط۔ یہ فیصلہ ۶؍ دسمبر کو شائع ہوا۔ یہ محض شق تحزب سے متعلق وضاحت و تشریح ہی نہیں تھی بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر ایک نئی بات پیدا کر دی گئی۔ اس اعلان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

> (قانونِ ہند کے مابین) اصلی وجہ نزاع صوبائی فریقوں سے متعلق ہے۔ وزارتی وفد کی شروع سے ہی یہ رائے رہی ہے کہ متفق علیہ صورت کی عدم موجودگی میں فریقوں کے فیصلے کثرتِ رائے سے طے پائیں۔ مسلم لیگ نے یہ رائے تسلیم کر رکھی ہے مگر کانگریس نے مختلف رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اعلان کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ صوبوں کو تحزب اور آئین دونوں کے متعلق خود فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔
>
> ملک معظم کی حکومت نے قانونی رائے حاصل کی ہے جو وزارتی مشن کی رائے کی موید ہے۔ اعلان کا یہ حصہ ۱۶؍ مئی کی تجویز کا اہم جزو ہے۔ اسی پر مبنی آئین کو ہی حکومت برطانیہ پارلیمان میں پیش کرنے پر رضامند ہوگی۔ لہذا مجلسِ دستور کی جملہ پارٹیوں کو چاہیئے کہ وہ اسے تسلیم کر لیں۔
>
> ظاہر ہے کہ اور توجیہی امور بھی پیدا ہوں گے۔ چنانچہ ملک معظم کی حکومت امید کرتی ہے کہ اگر مسلم لیگ کی کونسل مجلس دستور ساز میں شریک ہو جائے تو وہ اس پر بھی اتفاق کریں گے کہ جیسا کانگریس کا خیال ہے وہ توجیہی امور کسی ایک پارٹی کے ایما پر فیڈرل کورٹ میں وضاحت کے لئے پیش کئے جائیں اور اس کے فیصلے قبول کر لئے جائیں۔
>
> بپیشِ نظر اختلافی مسئلہ سے متعلق ملک معظم کی حکومت کانگریس سے تاکیداً کہتی ہے کہ وہ اسے تسلیم کرے تاکہ مسلم لیگ کے لئے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کا راستہ صاف ہو جائے۔ اگر اس کے باوجود مجلسِ دستور ساز کی خواہش ہو تو یہ بنیادی معاملہ فیصلہ کے لئے فی الفور فیڈرل کورٹ میں پیش کر دیا جائے۔
>
> مجلس دستور ساز کی کامیابی کا مدار متفقہ لائحہ عمل پر ہے۔ اگر ایسا آئین مرتب ہو گیا جس میں ہندی آبادی کے کسی کثیر طبقہ کو نمائندگی نہیں دی گئی تو ملک معظم کی حکومت اس آئین کو نارضامند

علاقوں پر مسلط کرنے پر تیار نہیں ہوگی۔

اس اعلان کی تمہید میں کہا گیا تھا کہ مذاکرات کا مقصد یہ تھا کہ مجلس دستور ساز میں تمام متعلقہ پارٹیوں کا اشتراک و تعاون حاصل کیا جائے۔ چونکہ مجلس کے کاروبار میں محض مسلم لیگ ہی شریک نہیں ہو رہی تھی اس لئے ان کانفرنسوں کا مقصد یہی تھا کہ کسی طریقے سے مسلم لیگ کو شرکت پر رضامند کیا جائے۔ یہ رضامندی بآسانی حاصل کی جا سکتی تھی اور اس کی ایک ہی صورت تھی، اور وہ یہ کہ کانگرس ۱۶ مئی کے اعلان کو صحیح معنوں میں تسلیم کر لیتی۔ مسلم لیگ کے نزدیک اس وقت اعلانِ مئی مردہ اور ناقابلِ احیاء ہو چکا تھا۔ وہ اسے اساسِ مفاہمت بنانے کے لئے تیار نہیں تھی — کانگرس کی مسلسل روش نے اس کی رائے کو اور مستحکم کر دیا گیا۔ مذاکرات نے ایک اور ثبوت بہم پہنچا دیا کہ کانگرس اپنی روش پر نظر ثانی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ۶ دسمبر کے اعلان سے مترشح ہوتا ہے کہ کانگرس کو اس کی غلطی — خطرناک غلطی — کا احساس دلانے کی اس سے زیادہ کوشش نہیں کی گئی کہ اسے یہ کہہ دیا گیا کہ اس کی روش غلط ہے۔ اس روش کو غلط قرار دینے کے جو آئینی نتائج برآمد ہوتے تھے برطانوی وزارت نے انھیں درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اگر کانگرس کی توجیہ غلط بلکہ مشن کی توجیہ سے بخطِ مستقیم برعکس تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ کانگرس نے ۱۶ مئی کا اعلان تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسے حتمی طور پر کہا جا سکتا تھا کہ اس کی توجیہ غلط ہے، لہٰذا اس کا دعویٰ کہ اس نے اعلانِ مذکورہ تسلیم کر لیا ہے غلط ہے۔ اور چونکہ اعلانِ مذکورہ پر اس وقت تک عمل درآمد مشکل ہے جب تک کہ متعلقہ فریق اس میں اشتراک و تعاون نہیں کرتے لہٰذا بحالاتِ موجودہ وہ اعلان ساقط العمل ہے۔ لیکن اس دلیرانہ روش کا مظاہرہ نہیں کیا گیا البتہ اس دلیری کی تلافی دوسری صورت سے کر دی گئی۔ برطانیہ کی حکمتِ عملی اس ضمن میں بین بین سی رہی۔ وہ نہ تو کانگرس کو قطعی جواب دے سکا اور نہ مسلم لیگ کی مخالفت کا استخفاف کر سکا کانگرس کی روش غلط قرار دے دینے کے باوجود اس نے مجلس دستور ساز کے انعقاد کی مخالفت نہیں کی اور نہ ایسا مشورہ ہی دیا۔ یہ ذکر کر کے بھی کہ اس نے اپنے قانونی مشیروں سے استصواب کر لیا ہے حکومت برطانیہ نے کانگرس کو یہ رعایت دے دی کہ اگر وہ اب بھی رضامند نہیں تو وہ اپنے خیال کے مطابق اس معاملہ کو بھی فیڈرل کورٹ میں پیش کر دے۔ آئینی اعتبار سے یہ اجازت دینا زیادتی تھی۔ کیونکہ خود اعلانِ مئی کے مطابق اعلان کی اساسات کو عدالت میں نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ صوبائی تحزب مکلماتِ اعلان میں سے تھا اور اس کا مفہوم صرف ایک تھا۔

حکومتِ برطانیہ اس طرح اعلانِ مئی کی حدود سے تجاوز تو کر گئی لیکن بطور اتمامِ حجت یہ تجاوز مفید رہا۔ اس سے کانگرس کی پوزیشن اور کمزور ہو گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ حکومتِ برطانیہ اس سے مرعوب ہو کر جھکنے کے لئے تیار نہیں، یا وہ مجبور ہے کہ یوں نہ جھکے۔ جس معاملہ میں واضعین اعلان ایک رائے رکھیں اور برطانوی حکومت کے قانونی مشیر اس رائے کی تصدیق کریں اس معاملہ میں کانگرس مختلف رائے رکھ کر فیڈرل کورٹ میں کیا کامیابی حاصل کر سکتی تھی؟ فیڈرل برطانوی حکومت کے قانونی مشیروں کی رائے کو کہاں تک غلط قرار دے سکتی تھی؟ کانگرس نے باوجود اپنے ادعا کے اس مسئلہ کو فیڈرل کورٹ میں پیش نہیں کیا۔

اس اعلان نے کانگرس کو پابند کر دیا اور مجبور کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرے اور اسے مجلس دستور ساز میں شریک کرے تاکہ ایسا متفقہ آئین تیار کرے جسے حکومتِ برطانیہ بآسانی پارلیمان میں پیش کر سکے کیونکہ اس اعلان میں صاف تحریر تھا کہ

> (. . . تاکہ) ہندوستانی ایسا آئین مرتب کر سکیں جسے ملک معظم کی حکومت پارلیمان میں پیش کرنے پر رضامند ہو۔ لہٰذا اس آئین پر مجلس دستور ساز کی تمام پارٹیوں کا اتفاق ہونا چاہیے۔

نیز یہ کہ

> اگر آئین ایسی مجلس دستور ساز نے مدون کیا جس میں ہندی آبادی کے کسی کثیر طبقہ کو نمائندگی نہ دی گئی تو ملک معظم کی حکومت اس آئین کو ناراضمند علاقوں پر مسلط کرنے پر تیار نہیں ہو گی۔

اس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ اگر مسلم لیگ مجلسِ دستور ساز میں شریک نہ ہوئی تو اس غیر آئینی اور بریدہ مجلس کا مدون کیا ہوا قانون ان علاقوں پر مسلط نہیں کیا جائے گا جہاں مسلمان آباد ہیں۔ بالفاظ صحیح تر ہندوؤں کا آئین ان صوبوں میں نافذ نہیں ہو گا جنہیں پاکستان کہا جاتا ہے۔ اتنے واضح انتباہ کے باوجود کانگرس نے اپنی روش پر نظر ثانی نہ کی اور وہ خودسری سے اندھادھند اسی راہ پر گامزن رہی۔ وہ بظاہر اکھنڈ ہندوستانی آمریت کی طرف جا رہی تھی لیکن وہ مزعومہ منزل پر پہنچی تو اس کی چشمِ تحیر و تحسر نے دیکھا کہ وہ اکھنڈ ہندوستان کی بجائے پاکستان پہنچ گئی ہے۔

مسلم لیگ کانگرسی روش کے پیشِ نظر مجلسِ دستور ساز سے عدم تعاون جاری رکھنے میں حق بجانب تو تھی ہی

اب چونکہ کوئی ایسے آثار نہیں تھے کہ کانگرس کی نگاہ کے زاویوں میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے یا وہ اب مسلم لیگ کے تعاون کی طلبگار رہے اس لئے اس نے عدم تعاون جاری رکھا۔ اعلانِ دسمبر نے اس کے ہاتھ اور مضبوط کر دیئے تھے۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں برطانوی حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ ملک معظم کی حکومت کسی ایسے آئین کے حق میں دستبردار نہیں ہوگی جو اقلیتوں کو نظر انداز کر دے۔ کانگرس نے اس منصفانہ اور صحیح حکمت عملی کو ناپسند کیا بلکہ اسے ٹھکرایا۔ وہ اس وقت سے بدستور حقائق کا ابطال کرتی رہی اور اپنی آمریت کے قیام کے لئے عجیب و غریب حرکتیں کرتی رہی۔ سنہ ۱۹۴۲ء کی کرپس تجاویز کو اس نے بدیں وجہ ٹھکرایا کہ برطانوی حکومت نے مسلمانوں کے جائز حق کو ضمناً تسلیم کیا اور ایسی گنجائش پیدا کی کہ کم از کم کاغذی طور پر ہی صوبوں کی علیحدگی کا حق تسلیم کر لیا گیا۔ منزلِ پاکستان کا یہ دوسرا سنگِ میل تھا۔ منزلِ پاکستان ہنوز دور تھی، ایسی دور کہ بعض ـــــ اور بیشتر وابستگانِ کانگرس تھے ـــــ اسے موہوم سمجھتے تھے۔ تاہم قدم اسی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں مسٹر گاندھی کی تائید سے راجگوپال اچاریہ نے ایک فارمولا[۱] پیش کیا جس میں ضلع وار پاکستان کے "جراثیم" تھے۔ اس فسادنیت کے باوجود جس نے سنہ ۱۹۴۰ء اور سنہ ۱۹۴۲ء میں امکاناتِ مفاہمت کو کالعدم کر دیا کانگرس ـــــ کسی نہ کسی شکل میں ـــــ پاکستان تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی۔ راجہ فارمولا اسی کتمان و تلبیسِ حق کا مظاہرہ تھا۔ سنہ ۱۹۴۵ء کی شملہ کانفرنس میں پھر کانگرس نے حقائق سے آنکھیں بند کیں اور دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی مردود کوشش کی۔ بند یا نیم وا آنکھوں سے یہ طائفہ اسی منزل کی جانب بڑھا جسے وہ وادیٔ ممنوعہ سمجھتا تھا۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے سیاسی مذاکرات نے کانگرس کی نوازش کے صدقہ میں پاکستان کی طرف حقیقی قدم اٹھایا۔ پاکستان سامنے دکھائی دینے لگا حتّٰی کہ مسلمان حتم و یقین کے طفیل دس سال تک کا انتظار ناقابلِ برداشت سمجھنے لگے۔ وہ بے تابی سے اپنی دس سال کی مساعی کا ثمرہ ہاتھ میں لے لینا چاہتے تھے۔ کانگرس نے مسلمانوں کا اضطراب کم کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ بھارت ماتا اور اکھنڈ ہندوستان کو دسمبر سنہ ۱۹۴۶ء تک تو لے ہی آئی تھی لیکن اسے یہاں رکنے نہیں دیا۔ جس شمشیرِ تقسیم کو وہ نیام میں ڈال کر گنگا برد کر دینا چاہتی تھی اسے اس نے غیر ارادی طور پر صیقل کرنا شروع کر دیا۔

---

[۱] ہم نے قصداً اس فارمولا اور اس کی پیشرو "تفریحی پیشکش" (Sporting Offer) کو حیطۂ بحث سے خارج رکھا ہے۔ کیونکہ یہ بے ضابطہ اعلانات اس غیر سنجیدگی اور طفلانہ انداز سے سامنے آئے تھے کہ انہیں سنجیدہ جائزے کا موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔

برطانیہ کے ہاتھ میں پوری طرح دے دینے سے پیشتر اس شمشیر کی تیزی و برندگی کا تجربہ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو کیا گیا۔ مسٹر اٹیلی وزیر اعظم برطانیہ نے دار العلوام میں اعلان کیا۔

ملک معظم کو یہ دیکھ کر از حد افسوس ہوتا ہے کہ ہندی سیاسی جماعتوں میں ابھی تک ایسے اختلافات موجود ہیں جن کے باعث مجلس دستور ساز مطلوبہ عمل و کارگذاری سے معذور رہے۔ . . .

موجودہ دور تذبذب پر از خطرات ہے اور غیر معین عرصہ تک جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ ملک معظم کی حکومت یہ وضاحت کر دینا چاہتی ہے کہ یہ ان کا حتمی ارادہ ہے کہ وہ ایسی تاریخ تک جو جون ۱۹۴۸ء سے متاخر نہ ہو اقتدار ذمہ دار ہندی ہاتھوں میں منتقل کر دے گی۔

لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس معین تاریخ تک مکمل نمائندہ مجلس دستور ساز کوئی (متفقہ) آئین مدون نہیں کر سکے گی تو ملک معظم کی حکومت اس پر غور کریگی کہ برطانوی ہند کی مرکزی حکومت کے اختیارات معین تاریخ تک کس کے سپرد کئے جائیں۔ (یعنی) آیا وہ مکمل طور پر برطانوی ہند کی کسی مرکزی حکومت کو دیدیئے جائیں یا بعض علاقوں میں موجودہ صوبائی حکومتوں کو یا کسی اور طریقہ سے جو معقول ترین نظر آئے اور جس میں باشندگانِ ہند کا بہترین مفاد ہو۔

انتقالِ اقتدار کا عمل جاری ہو جانے پر ۱۹۳۵ء کے قانونِ ہند پر عمل درآمد بتدریج مشکل ہوتا جائے گا لہذا انتقالِ اقتدار کے لئے مناسب اور بروقت قانونی تبدیلی کی جاتی رہے گی۔

ملک معظم کی حکومت جن نمائندوں کے حق میں اقتدار منتقل کرنے کی تجویز کریگی ان سے انتقالِ اقتدار سے پیدا ہونے والے معاملات سے متعلق معاہدے مرتب کرے گی۔

اس انتقال کی ذمہ داری سے لارڈ ویول وائسرائے ہند کو سبکدوش کر دیا گیا اور ان کی بجائے لارڈ مونٹ بیٹن کے تقرر کا فیصلہ ہوا جنہیں ہندوستان کا آخری وائسرائے اور گورنر جنرل کہا گیا۔

اس اعلان میں کانگرس کا ایک اور مطالبہ پورا کیا گیا۔ وہ ایک عرصے سے متمنی تھی کہ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ مقرر کر دی جائے۔ برطانیہ اب تک اس تعین سے گریز کرتا چلا آرہا تھا اور یہی انسب بھی تھا۔ لیکن اب کانگرس کی مسلسل غیر مصالحانہ اور تخریبی روش نے یہ اعلان ناگزیر کر دیا تھا۔ اس دور تذبذب کو

غیر معین عرصہ کے لئے جاری نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ جون ۱۹۴۸ء کا تعین بظاہر آزادیِ ہند کی آخری تاریخ تھی، لیکن در اصل یہ کانگرس کو الٹی میٹم تھا کہ اگر اس نے اس معین عرصہ میں اپنی روش بدل نہ لی تو اینگلو ہندو ملی بھگت اکھنڈ ہندوستان کا تحفظ کرنے سے قاصر رہے گی اور بامر مجبوری قیام پاکستان کا اعلان کر دینا پڑے گا۔

اس اعلان میں یہ امر فیصلہ طلب اور تشنہ تھا کہ انتقالِ اقتدار کس کے سپرد ہوگا یعنی نمایندوں کا تعین کن اصولوں پر ہوگا۔ لیکن اسے تشنہ ہی رہنا چاہئے تھا کیونکہ اس کا فیصلہ کانگرس کی روش پر منحصر تھا۔ اگر اب بھی وہ مفاہمت جوئی اور مصالحت طلبی کی اہمیت وافادیت کی قائل ہو جاتی تو نمایندوں کے اس تعین کا مسئلہ خارج از بحث ہو جاتا۔ کانگرس نے اس اعلان کا بھی حسب عادت خیر مقدم کیا۔ اس کی مجلس عاملہ نے ۸ مارچ کو ایک قرارداد میں مسلم لیگ کے نمائندوں کو دعوت دی کہ وہ نمایندگانِ کانگرس سے ملاقات کریں تاکہ اس اعلان سے پیدا شدہ صورتِ حال پر غور وخوض کیا جائے۔ یہ دعوت بے معنی تھی --- اور مسلم لیگ کے نزدیک منافقانہ --- مسلم لیگ کو کس مقصد کے لئے بلایا جا رہا تھا؟ اس ممکن ملاقات میں کون سے امور طے پاتے؟ ۱۹۴۶ء کے مئی اور جون کے اعلانات بطور اساس مفاہمت موجود تھے۔ کانگرس انہیں ٹھکرا چکی تھی۔ فروری ۱۹۴۷ء کے پیشرو آٹھ مہینوں میں کانگرس نے تسلسل وتکرار سے تخریبی پہلو اختیار کیا تھا اور اسی پر قائم چلی آرہی تھی۔ وہ مسلم لیگ کا اعتماد کھو چکی تھی، بلکہ اس نے یہ اعتماد پیدا ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ یقینی بداعتمادی کے پس منظر میں، جبکہ لندن تک میں مصالحت نہیں ہوسکی تھی۔ مسلم لیگ اس دعوت کو کس امید پر قبول کرسکتی تھی؟ کانگرس نے اس دعوت کے ساتھ اسی نشست میں ایک اور قرارداد منظور کی جس میں تقسیم پنجاب کا مطالبہ کیا۔ یہ صوبائی تقسیم دودھاری تلوار تھی جسے کانگرس نے بطور حربۂ یاس استعمال کیا۔ وہ مسلمانوں کے مقابلہ میں سکھوں کو استعمال کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے سکھوں کے سامنے علیحدہ غیر مسلم پنجاب (سکھستان؟) کا سبز باغ پیش کیا۔ یہ قابلِ ذکر امر ہے کہ اس قرارداد میں تقسیم بنگال کا مطالبہ نہیں تھا۔ اس مطالبہ کے محض پنجاب تک محدود رکھنے میں یہی شرانگیز مصلحت تھی کہ سکھوں کو موہوم امید دلا کر جماعتی طور پر مسلمانوں کے مقابلہ میں صف آرا کیا جائے۔

کانگرس ایک عرصہ سے اس کوشش میں مصروف تھی کہ پنجاب میں سکھوں کو مسلمانوں کے خلاف صف آرا کرے۔ سکھ کوئی واضح موقف سامنے نہیں رکھتے تھے۔ ۱۹۴۵ء کے انتخاباتِ عامہ میں وہ کانگرس کے خلاف لڑے

اور پنجاب اسمبلی کی بیشتر سکھ نشستوں پر قابض ہو گئے۔ برطانیہ بوساطت گلینسی (گورنر پنجاب) اور ہندو کانگرس کی سازش سے خضر حیات کی قیادت میں وزارت قائم ہوئی جو کانگرس، اکالی، یونینسٹ جیسے متضاد عناصر سے مرکب تھی۔ ان میں قدرِ مشترک مخالفت مسلم لیگ تھی۔ اس وزارت کی شکست پر سکھ کو اور آگے بڑھایا گیا۔ مارچ میں کانگرس نے تارا سنگھ کی تلوار بے نیام کی اور پنجاب میں قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ کانگرس نے اس خون و آتش کے کھیل کو اعلانیہ سودا بازی کا وسیلہ بنایا اور تقسیم پنجاب کا مطالبہ کر دیا۔ ان فسادات کے بغیر نہ سکھ قطعی طور پر مسلمانوں کے دشمن بن سکتے تھے نہ تقسیم کی کامیابی کے امکانات روشن ہو سکتے تھے۔ چنانچہ تنہا پنجاب کی تقسیم کا سوال اسی لئے پیدا کیا گیا کہ سکھ اس سبز باغ کی پرفریب بہار میں الجھے رہیں جس کی حیثیت خانۂ پائے خزاں سے زیادہ نہ تھی اس وقت سکھوں نے پاکستان میں مؤثر اقلیت کی بجائے وہ قطرۂ آب جتنا گوارا کر لیا ہے جس کی عشرت فنا کا بے پایاں سامان "بحرِ ہند" میں موجود ہے۔

ایک اور قرارداد میں کانگرس نے مطالبہ کیا کہ انتقالِ اقتدار کے لئے یہ ضروری ہے کہ عبوری مرکزی حکومت کو نوآبادیاتی حکومت تسلیم کیا جائے۔ نیز اسے مکمل طور پر بااختیار اور ذمہ دار کابینہ کی حیثیت دی جائے۔ عبوری مرکزی حکومت میں کانگرس اور مسلم لیگ بطور حلیف و معاون نہیں بلکہ بطور حریف و مخالف شامل تھیں۔ حکومت کے فیصلے متفقہ یا کثرت رائے سے نہیں ہوتے تھے۔ یعنی حکومت کی اجتماعی ذمہ داری مفقود تھی اور خود کانگرس برطانوی حکومت سے درخواست کر چکی تھی کہ مسلم لیگ کو حکومت سے خارج کر دیا جائے یہ آئینی طرز کی مخلوط وزارت نہیں تھی۔ ایسی وزارت کو کابینہ قرار دینا آئین جمہوریت سے تلعب ہوتا۔

ان متضاد قراردادوں کے ہوتے ہوئے کانگرس کی دعوتِ ملاقات بے معنی تھی۔ تقسیم پنجاب کی قرارداد صریحاً وزارتی مشن کے اعلان کی نقیض تھی۔ حالانکہ اب تک اساسِ مفاہمت وہی اعلان تھا۔ خود کانگرس نے اس نشست میں اس امر کا اقرار کیا کہ وہ اسی اعلان پر کاربند ہے اور اس کی مجلس دستور ساز اس اعلان کے مطابق مصروفِ عمل ہے۔ ایسے میں مسلم لیگ کی طرف سے اس دعوت کے قبول کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

سیاسی تعطل جوں کا توں رہا تا آنکہ تقسیم کی وہ منزل آخر میں آپہنچی جس کا اعلان ۳ رجون کو ہوا اور جس میں ہم اس وقت داخل ہیں۔

اس اعلان میں اس مجلسِ دستور ساز کو علیٰ حالہ رہنے دیا گیا جسے کانگرس نے منعقد کر رکھا تھا اور جس میں مسلم لیگ شامل نہیں تھی۔ البتہ اس کے مقابلہ میں ایک نئی مجلسِ دستور ساز کی گنجائش پیدا کر دی گئی جو ان علاقوں کے نمایندوں پر مشتمل ہوگی جو موجودہ مجلس میں شامل ہونا پسند نہیں کریں گے۔

اس کے علاوہ تقسیم ہند کے ساتھ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا بھی اصول تسلیم کر لیا گیا اور اس کا طریقِ کار پیش کیا گیا۔ صوبائی تقسیم کے لئے دونوں صوبوں کی اسمبلیوں کو دو حصوں پر تقسیم کر دیا گیا۔ یہ حصے ان علاقائی حصوں پر مبنی تھے جو تخمیناً ہندو اور مسلمان علاقوں پر مشتمل تھے اور جن کا صحیح تعین بعد میں ایک مجلس تحدید کو کرنا تھا۔ اس صوبائی تقسیم کی طرف برطانیہ کا میلان وزارتی مشن کے اعلان میں بھی پایا جاتا تھا لیکن یہ کن مقاصد کے تحت عمل میں لائی گئی انھیں بعد کے لرزہ خیز واقعات نے عالم آشکار کر دیا۔ صوبائی تحدید کا فریضہ انگلستان کے ایک قانون داں سر سرل ریڈکلف کے سپرد کیا گیا جس کا فیصلہ حق و انصاف کی بجائے ان مردود سیاسی مصالح پر مبنی تھا جس نے اس شجر زقوم کو پیدا کیا جس کے ثمرِ تلخ کے اثرات سے ہمارے کام و دہان برسوں فارغ نہیں ہو سکیں گے۔

اعلان جون کے آٹھویں پیرے کی غلط اور دور از کار توجیہ کر کے قائد اعظم کے الفاظ میں سر سٹیفورڈ کرپس نے پیشہ قانون پر دھبہ لگایا تھا اور اپنی قانونی قابلیت کو ذلیل تھا بعینہٖ انگلستان کے اس دوسرے قانون دان نے حق و انصاف کا خون کر کے قانونی پیشہ کو ذلیل کیا اور روسیاہی حاصل کی۔ لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون ان بدنام کنندگانِ قانون کے کندھوں پر ہے۔

صوبائی مجالسِ مقننہ کی ظنی (Notional) تقسیم اصولی طور پر غلط تھی۔ قانونی اعتبار سے اس میں یہ سقم تھا کہ اسی سے آئندہ فیصلہ کا رجحان معلوم ہوتا تھا۔ اس ظنی تقسیم نے مسلمان اکثریت کے علاقے پہلے ہی مجوزہ پاکستان سے نکال دیئے اور انھیں مجبور کر دیا کہ وہ ہندو اکثریت کے مقابلہ میں ووٹ دیں۔ یہ تجویز کہ تقسیم شدہ صوبائی اسمبلیاں علیحدہ علیحدہ یہ فیصلہ کر دیں کہ آیا صوبے تقسیم ہوں یا نہ مضحکہ انگیز تھی کیونکہ مسلمان جو من حیث القوم صوبائی تقسیم کے خلاف تھے وہ لازماً تقسیم کے خلاف رائے دیتے۔ علیٰ ہذا القیاس ہندو اور سکھ مل کر تقسیم کے حق میں رائے دیتے۔ ان دونوں اسمبلیوں میں سے ایک بھی تقسیم کا فیصلہ کر لیتی تو تقسیم یقینی قرار دے دی جاتی۔ تقسیم کا فیصلہ صوبوں کی غیر منقسم اسمبلیوں کے سپرد اس لئے نہ کیا گیا کہ پنجاب اور بنگال میں مسلم لیگ مسلم نشستوں پر

قابض تھی۔ اور یہ خدشہ تھا کہ تقسیم کی قرارداد آرار کی کثرت حاصل نہیں کر سکے گی۔ اور کسی ایک اسمبلی کے فیصلہ پر تقسیم کا مدار اس لئے رکھ دیا گیا کہ دونوں صوبوں میں ایک ایک اسمبلی ہندو اکثریت کی مالک تھی۔ یہ دوسرا مذاق تھا۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ تقسیم کا قطعی فیصلہ دے دیا جاتا اور حد بندی مجلسِ تحدید کے سپرد کی جاتی۔ اس غیر جمہوری طریقہ کو جمہوریت کا لباس پہنا کر بزعم خود جائز اور حق بجانب بنا دیا گیا۔

تقسیم کا فیصلہ کرنے سے پیشتر ان صوبوں کی غیر منقسم مجلسِ مقننہ کا ایک اجلاس ہوتا تھا جس میں یہ طے ہوتا تھا کہ اگر صوبہ تقسیم نہ ہوا تو وہ کس مجلس دستور ساز میں شامل ہوگا۔ (یعنی پاکستانی مجلس میں یا ہندوستانی مجلس میں)۔ ان شرائط میں تقسیم پنجاب و بنگال ناگزیر تھی۔ کیونکہ اگر فیصلہ پاکستانی مجلس کے حق میں ہوتا تو ہندو اور سکھ اسمبلی ضرور تقسیم کا فیصلہ کرتی۔ بصورتِ دیگر یہی فیصلہ مسلمان اسمبلی کر دیتی اور اعلان زیرِ نظر کے مطابق کسی ایک اسمبلی کے فیصلے سے تقسیم لازمی ہو جاتی۔

مجلسِ تحدید کے سپرد یہی کام تھا کہ وہ آبادی کے لحاظ سے ملحق مسلم اور ملحق غیر مسلم علاقے متعین کرے۔ تحدید کا اصل الاصول آبادی تھا۔ البتہ مجلس کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ "دیگر عوامل" کو بھی ملحوظ رکھے۔ ان عوامل میں اقتصادی اور انتظامی تقاضے آ سکتے تھے۔ مگر ان معصوم الفاظ میں ملک معظم کی حکومت نے زہریلے نشتر پنہاں رکھے تھے۔ مسٹر اٹیلی نے دارالعوام میں یہ غیر معقول اور فتنہ انگیز بیان دیا کہ سکھوں کی نازک پوزیشن کے پیشِ نظر ان کو زیادہ علاقہ دیا جائے گا۔ لارڈ مونٹ بیٹن وائسرائے ہند نے ایک اخباری ملاقات میں یہ غیر معتدل بات کی کہ گورداسپور کا ضلع سکھوں کے حوالہ کیا جا سکے گا۔ مسٹر آرتھر ہنڈرسن نائب وزیرِ ہند نے ایک موقع پر کہا کہ "دیگر عوامل" سے مراد سکھ گوردوارے ہیں۔ یہ بھانت بھانت کی بولیاں ان درپردہ سازشوں کو منکشف کر رہی تھیں جو اس اعلان کے پس منظر تھیں۔ غیر جانبداری اور عدل کے تقاضے بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے اور برطانیہ اعلانیہ طرفداری سے کام لے رہا تھا۔ اعلانیہ طرفداری شاید اتنی قابلِ مذمت نہ ہوتی جتنی درپردہ سازشیں مردود تھیں۔ یہ مخفی سازشیں رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں اور جب ان کے نتائج ظاہر ہوئے تو انسانیت مظلوم دیکھے کس انسانیت دریائے خون میں غرق تھی اور اخلاق ماتم کناں تھا۔

اعلانِ جون میں پاکستان کے ایک ایک صوبہ سے خصوصی برتاؤ کیا گیا۔ پنجاب اور بنگال کو تقسیم کر دیا گیا۔

مسلم لیگ آسام کا بھی مطالبہ کر رہی تھی۔ اس میں سے صرف سلہٹ کا ضلع کاٹ کر مشرقی بنگال کے ساتھ ملا دیا گیا۔ سر سرل ریڈ کلف نے اپنی طرف سے مزید قطع و برید کی اور پنجاب، بنگال اور سلہٹ کے کئی حصے جن میں مسلمان نمایاں اکثریت کے مالک تھے اور مسلم اکثریت کے علاقوں سے وہ علاقے متصل اور ملحق تھے غیر مسلم علاقوں کے ساتھ ملا دیئے گئے۔ ظنی تقسیم عارضی تھی۔ وہ کم و بیش ہو سکتی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے "کم" ہوئی اور ہندوؤں کے لئے "بیش"۔ ظنی تقسیم نے جو علاقے ہندوؤں کے سپرد کئے اس میں سے ایک انچ زمین بھی نہیں نکالی گئی حالانکہ مسلمانوں کے حصے میں ضرور کمی کر دی گئی۔

صوبہ سرحد سرزمینِ بے آئین مشہور تھا۔ اصلاحات عطا ہو جانے پر بھی یہ سرزمین بے آئین ہی رہی۔ کانگرسی دورِ اقتدار نے بے آئینی کو اور استحکام بخشا۔ اب انگریز کے ساتھ ہندو بھی تھا۔ تازہ انتخاباتِ عامہ نے سرحدی اسمبلی میں کانگرس کو اکثریت بخشی تھی۔ انتخابات کے بعد حالات ایسے بدلے کہ سرحد کے غیور پٹھان کانگرسی وزارت کے دشمن بن گئے اور انھوں نے اسے اکھاڑ پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس صوبہ میں کانگرس اسمبلی کے ایوان میں اکثریت کی مالک ضرور تھی لیکن بیرونِ ایوان عوام میں وہ اپنا اعتماد ضائع کر چکی تھی۔ گورنر اور وائسرائے کو اس ہمہ گیر ناراضی کی طرف توجہ دلائی گئی۔ وائسرائے نے ایک مرتبہ اس معاملہ کو ہاتھ میں بھی لینا چاہا لیکن پنڈت نہرو کی حکومت نے سرحد میں کانگرسی وزارت کی شکست کو گوارا نہ کیا۔ وائسرائے خاموش ہو گئے۔ صوبہ بھر میں حکومت کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی۔ فروری کے تیسرے ہفتہ سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ اور اب تک بدستور جوش و خروش سے چل رہی تھی، حکومت کا کاروبار معطل ہو چکا تھا۔ وزارت ذلیل و ناکام ہو چکی تھی۔ بے جان سلیمان لاٹھی ٹیکے کھڑا تھا۔ انگریز کانگرس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا کہ یہ مردہ زندہ ہی نہیں صحت مند بھی ہے جون کے اعلان نے اس عصا کو کرم خوردہ کیا۔ صوبہ سرحد پر استصواب کی پابندی لگائی گئی۔ اسے استصوابِ عامہ میں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ہندی مجلسِ دستور ساز میں شامل ہو یا پاکستانی مجلسِ دستور ساز میں۔ ایسا ہی استصواب سلہٹ میں بھی روا رکھا گیا۔ وائسرائے نے یہ استصوابات اپنی نگرانی میں کرائے اور یہی مسلم لیگ کا مطالبہ تھا سرحد اور سلہٹ دونوں پاکستان میں شامل ہو گئے۔

صوبہ سندھ مسلم صوبہ ہے۔ اس کی مسلم آبادی ستر فی صدی سے اوپر ہے۔ کراچی کے ہم شہر اور غوغا آواز

ہندو ایک گمنام گوشئہ کو 'ہندوستان' بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ وہی ہندو جو ایک مقامی ہندو اخبار کے اسی ضمن میں کہے ہوئے الفاظ کے مطابق رائی کا پہاڑ بنا سکتے ہیں، یہ بے سروپا باتیں کر رہے تھے۔ اس شور و شغب سے متاثر ہو کر سندھ پر بھی پابندی لگائی گئی کہ وہ اپنی مجلس مقننہ کے ایک خصوصی اجلاس میں یہ فیصلہ کرے کہ وہ ہندوستانی مجلس میں شامل ہو گا یا پاکستانی مجلس میں۔ سندھ جو چند ماہ قبل دوبارہ انتخابات کے موقع پر غیر لیگی اکثریت خاک نامرادی میں ملا چکا تھا۔ وہ صوبہ جس نے اس سے پیشتر اس سے کم مسلم کثرت کے باوجود اسمبلی کے ذریعہ پاکستان کا مطالبہ کیا تھا، اسی صوبہ سندھ کو یہ زحمت دی گئی کہ انتخابات کے بین نتائج کے باوصف یہ فیصلہ کرے۔ اس عجیب اور غیر ضروری پابندی کے جواز میں کہا جا سکتا ہے کہ اس سے ہندو پروپیگنڈہ کا مسکت جواب دینا مقصود تھا۔ ہو سکتا ہے لیکن کیا اس صوبہ میں علیحدگی کا ہندوآنہ مطالبہ بے سروپا اور خلافِ عقل تھا؟ تیس فی صدی ہندو جو کسی حصہ میں بھی اکثریت نہیں رکھتے تھے اور اگر رکھتے بھی تو وہ علاقہ ہندوستان سے متصل نہ ہوتا ان کی علیحدگی یعنی چہ؟ اس قسم کے فرقہ وارانہ جزیرے تو خارج از بحث تھے۔

بلوچستان ابھی تک اصلاحات سے ہم کنار نہیں ہوا۔ برطانوی مشن کے اس علاقہ کو ایک نمائندہ مجلس دستور ساز میں بھیجنے کی اجازت دی تھی۔ یہ نمائندہ مسلم لیگ کی تبیع میں شریک مجلس نہیں ہوا۔ اس کے باوصف اس صوبہ سے بھی یہ دریافت کیا جانا ضروری سمجھا گیا کہ یہ کس مجلس میں شامل ہوگا۔

یہ امر بدیہی طور پر حیران کن معلوم ہو گا کہ یہ پابندیاں محض مسلم صوبوں اور علاقوں پر عائد کی گئیں لیکن سارے پس منظر میں دیکھنے سے اس کی علت بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے۔ ۱۹۴۶ء میں صوبہ بہار کے مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا اس کا آئندہ کے لئے سدباب کرنے کے خیال سے مسلمانوں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ صوبہ میں مسلمانوں کی متفرق آبادی کو زیادہ سے زیادہ طور پر یکجا کر دیا جائے تاکہ ایسے موقعوں پر وہ اپنی منظم مدافعت کر سکیں۔ یہ مطالبہ حقیقی خدشات اور صحیح تجربات پر مبنی تھا اس کے باوجود صوبہ بہار پر یہ پابندی عائد نہ کی گئی کہ وہ بھی اپنی اسمبلی کے خصوصی اجلاس میں ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک کو منتخب کرے۔ علیٰ ہذا القیاس مغربی یوپی کے مسلمان بھی علیحدگی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس صوبہ پر کسی قسم کی شرط عائد نہیں کی گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمان صوبوں نے وہی فیصلے دیئے جو مسلمان چاہتے تھے۔ مگر ان کے فیصلوں کو پہلے ہی سے کیوں فرض نہ کر لیا گیا

جیسا کہ ہندو صوبوں کے سلسلہ میں کیا گیا؟

بہرکیف مسلمان نے صبر و تحمل سے کام لیا اور اپنی ذمہ داریوں کا کماحقہ احساس رکھتے ہوئے بہ صمیم قلب فیصلہ قبول کر لیا۔ ہندوؤں کی طرف سے پنڈت نہرو نے اور سکھوں کی طرف سے بلدیو سنگھ نے بھی اعلان مذکورہ کو قبول کر لیا لیکن ان کی قبولیت میں کہاں تک دیانت اور صداقت تھی اس کا فیصلہ بعد کے حادثات نے کیا۔ کانگرس عادتِ مستمرہ کے مطابق منافقت کی روش پر ہی قائم رہی۔ اس نے دل سے تقسیمِ ہند کو قبول نہیں کیا۔ وہ بدستور اس امر کی خواہشمند ہے کہ پاکستان پھر سے ہندوستان میں جذب ہو جائے۔ اس نے اس خواہش کو راز داری میں نہیں رکھا۔ اس کے دل سے ہوک اٹھتی ہے اور وہ بے بسی اور بے چارگی سے چلا اٹھتی ہے کہ پاکستان کی علیحدگی ہمالیہ جیسی عظیم غلطی ہے چنانچہ اب ہندوستان کی خارجہ حکمتِ عملی اسی منفی اساس پر چل رہی ہے کہ پاکستان بطیبِ خاطر واپس نہ آئے تو اسے فتح کیا جائے۔ اس کے برعکس مسلمان کی روح قومی قائدِ اعظم کے منہ سے یہ اعلان کرا چکی ہے کہ

پاکستان قائم ہو چکا ہے اور انشاء اللہ قائم رہیگا۔

ولو کرہ الکافرون!

غم نہ کر

گر فضا ہے تیرہ و تار اے مسلماں غم نہ کر
ظلمتِ شب سے سحر ہوگی نمایاں غم نہ کر

ہر طرف سے آفتوں نے گرچہ گھیرا ہے تجھے
مژدۂ لَا تَقْنَطُوْا دیتا ہے قرآں غم نہ کر

میں نے مانا تجھ پہ ٹوٹا ہے مصیبت کا پہاڑ
شاید اس میں بھی کوئی نعمت ہو پنہاں غم نہ کر

خالی از حکمت نہیں ہوتا کوئی فعلِ حکیم
پختہ ہے جب حکمتِ باری پہ ایماں غم نہ کر

پھر نظر آئیں گی اس میں لہلہاتی کھیتیاں
گر زمیں سیلاب نے کر دی ہے ویراں غم نہ کر

ہے یہی رفتار جلد اس کے گذرنے کی دلیل
ہو چلی ہے تیز اگر رفتارِ طوفاں غم نہ کر

آگ جو اس نے جلا رکھی ہے اوروں کے لئے
خود اسی کی نذر ہوگا کفر و طغیاں غم نہ کر

جس نے آزادی کی دولت سے نوازا ہے تجھے
ہے اس آزادی کا وہ خود ہی نگہباں غم نہ کر

عزم و ہمت سے قدم رکھ تو سہی میدان میں
غیب سے ہو جائیگا نصرت کا ساماں غم نہ کر

رائگاں ہرگز نہ جائیں گی تری قربانیاں
رنگ لائے گا ابھی خونِ شہیداں غم نہ کر

اے اسدؔ اللہ پہ پورا بھروسہ چاہیئے
مشکلیں ہو جائیں گی اپنی سب آساں غم نہ کر

اسدؔ ملتانی

قرآنی تعلیم

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

اس وقت دنیا کے مسلمانوں پر مصیبتوں کی جو گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں ان کے اسباب وعلل سے ہم آئندہ کسی مقالہ میں بحث کریں گے. آج ہم صرف اپنے ہندوستانی مسلمان بھائیوں کی حالت پر نظر ڈالنی چاہتے ہیں. ہمارے اوپر جو آفتیں ٹوٹی ہیں یا ٹوٹ رہی ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی حالت کو گہری نظر سے دیکھیں اپنے دین اور اپنے اسلام کا جائزہ لیں، اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ ان آفتوں کے اسباب کیا ہیں۔ صرف ظاہری اسباب میں الجھ کر نہ رہ جائیں بلکہ معنوی اسباب پر بھی غور کریں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سربلند معزز اور حکمراں رکھنے کے حتمی وعدے فرمائے ہیں۔ پھر یہ کیا ہوا کہ ہمارے اسلافِ کرام پر اللہ تعالیٰ نے جو انعام و اکرام کئے تھے وہ سب ہم سے چھین لئے اور عذابوں اور رسوائیوں میں ہم کو مبتلا کر دیا؟ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے وعدے غلط نہیں ہو سکتے. جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے۔

إِنَّ اللهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝

اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

اس لئے یہ یقینی ہے کہ ان نگوں بختیوں کے اسباب خود ہمارے ہی اندر ہیں اور ہمارے عقائد اور اعمال ایسے ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے ہمارا صحیح مسلمان ہونا اللہ کے نزدیک مسلّم نہیں رہا۔

قرآن کریم کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہمارے جرائم بہت ہیں۔ سب سے بڑا جرم ہمارا تو اجتماعی ہے کہ مدتہائے دراز سے ہم نے ملت کی وحدت کا خیال نہیں رکھا اور دینی اور سیاسی ہر لحاظ سے ہمارے علماء اور سلاطین ملت کا شیرازہ بکھیرتے رہے۔ یہاں تک کہ پوری امت کا تقریباً ۳/۴ حصہ کفر و شرک سے مغلوب اور غیروں کا محکوم ہو گیا۔ لیکن یہ بیان ایک مفصل توضیح کا محتاج ہے جس کو ہم آئندہ لکھیں گے. اس اجتماعی خرابی کے علاوہ عام مسلمانوں

میں غلط رہنمائی سے شرک و بدعت نے راہ پائی۔ حقائقِ قرآنی سے بے خبر ملاؤں اور پیروں نے اپنی اپنی تعلیمات اور اپنی اپنی پیدا کی ہوئی بدعات کے حجابات اللہ کی تعلیمات پر ڈال دیئے اور توحید کو جو اسلام کی اصل بنیاد ہے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ آج کیفیت یہ ہے کہ دنیا کا ہر مسلمان زبان سے تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ پر اور اس کی وحدانیت پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن عملاً لاکھوں اور کروڑوں مسلمان اس حی و قیوم مالک عرشِ بریں کے علاوہ زیرِ زمیں بہت سے "خدا" بنائے ہوئے ہیں۔ وہ ان اولیاء اور صلحاء امت کے مزاروں کو جن کو وہ مقبولینِ بارگاہ سمجھتے ہیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہیں۔ وہاں جا کر مرادیں مانگتے ہیں، مصیبت سے نجات، بیماری سے صحت اور اولاد اور تجارت کی کامیابی کی درخواستیں کرتے ہیں۔ بہت سے بزرگوں کے سالانہ عرس کرتے، ان کی قبروں پر چڑھاوے چڑھاتے، نذرانے گزارتے، منتیں مانتے اور شرکیہ رسوم بجا لاتے ہیں۔ اور ان کو امورِ طبیعی اور عالمِ مادی میں متصرف سمجھ کر اللہ کا شریک گردانتے اور شرک کے مرتکب ہوتے ہیں جو ایسا گناہ ہے کہ کبھی بخشا نہیں جا سکتا۔ قرآن نے بار بار تصریح کی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ

اللہ اپنے ساتھ شریک بنانے کے گناہ کو ہرگز نہیں بخشے گا اور اس کے سوا اور جس کو چاہیگا بخشے گا۔

یہ تو مشرکوں کے متعلق فرمایا ہے اور جو شخص ایمان لا کر شرک کرے اور اللہ کی توحید کا اقرار کرنے اور کلمہ پڑھ لینے کے بعد بھی دوسروں کو اس کا ساجھی سمجھے وہ تو اور بھی بڑا مجرم ہے۔ اس کے لئے بخشائش تو کجا اس کے سارے اعمال ہی اکارت ہو جاتے ہیں۔ سورۂ زمر میں ہے۔

وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ
لَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔

تمہاری طرف بھی اور تم سے پہلے جو تھے ان کی طرف بھی وحی کی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو
ضرور تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور تم خسارہ میں رہو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر پھنکوا دیا اس دن شیطان اس سے تو مایوس ہو گیا کہ ان کی امت سے بت پجوا سکے گا۔ اس لئے اس نے دوسرے راستہ سے ان کو شرک میں پھنسایا یعنی

بزرگانِ دین کی محبت اور عقیدت ان کے دلوں میں اس قدر بھر دی کہ وہ ان کو اپنے اور اپنے معبود کے درمیان واسطہ بنانے لگے۔ حالانکہ بت پرست بھی یہی کہتے تھے جیسا کہ قرآن نے ان کا مقولہ نقل کیا ہے۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

ہم ان (دیوتاؤں) کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب تر کردیں۔

قرآن نے انبیاء اولیاء اور مقربینِ بارگاہ کے مدارج بیان کئے ہیں اور ان کی مقبولیت اور بزرگی بھی ظاہر کی ہے۔ ان کی تعظیم ممنوع نہیں ہے۔ لیکن تعظیم اور ہے اور بندگی اور ہے۔ ان میں سے کسی میں کوئی خدائی طاقت قرآن نے نہیں تسلیم کی ہے۔ نہ ان میں سے کسی کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اللہ کے شریک یا سفارشی سمجھے جائیں۔ کافروں کے عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ

قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۱۸-۱۰)

اور وہ اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہیں۔ کہدو کہ کیا تم اللہ کو ان کے ذریعہ سے خبر پہنچاتے ہو جن کو آسمان اور زمین کی کسی شے کا علم نہیں ہے۔ اللہ پاک اور بالاتر ہے ان سے جن کو وہ شریک گردانتے ہیں۔

عالمِ برزخ جس میں شہداء کے سوا باقی مردے رکھے جاتے ہیں قرآن کے نزدیک مطلق عالمِ ممات ہے جس میں حیات کا کوئی شائبہ نہیں۔ ان اولیاء اور بزرگانِ دین کی بابت جن کو لوگ پوجتے ہیں قرآن میں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ

وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۲۱-۱۶)

اور جن کو وہ اللہ کے ماسوا پکارتے ہیں وہ کوئی شے پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کئے جاتے ہیں۔ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں اور (انہی بھی) خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائینگے

اس آیت میں جن معبودانِ ماسوا اللہ کا ذکر ہے وہ بت یا شجر یا شمس یا قمر وغیرہ بے جان چیزیں نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے لئے نہ اموات کا لفظ مستعمل ہو سکتا ہے نہ احیاء کا۔ بلکہ یہ وہی بزرگانِ دین ہیں جن کو لوگ معبود بنا کر اور متصرف

مان کر پوجتے ہیں۔ دوسری آیت میں اس امر کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُو مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَائِهِمْ

غَافِلُونَ۔ وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كَافِرِينَ (۲۶)

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ کے سوا ان لوگوں کو پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک بھی اس کو

جواب نہیں دینے کے۔ اور وہ ان کی پکار سے بے خبر ہیں۔ اور جب لوگ حشر کے لئے اٹھائے جائیں گے

تو وہ ان کے دشمن ہو جائیں گے اور ان کی پرستش کا انکار کر دینگے۔

اس سے جہاں اس بات کی تصریح نکلی کہ معبودانِ غیر اللہ پکارنے والوں کی پکار سے بے خبر ہیں وہاں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ معبود بت وغیرہ بے جان چیزیں نہیں ہیں بلکہ بزرگانِ دین اور مقبولینِ بارگاہ ہیں جن کی وہ پوجا کرتے ہیں اور جو قیامت کے دن ان کی پرستش کا انکار کر دیں گے۔ کیونکہ بے جان چیزوں میں انکار کی قدرت نہیں۔ تیسری آیت میں ان معبودانِ غیر اللہ یعنی بزرگانِ دین کی سماعت کا انکار ہے۔

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ۔ إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ

وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ۔ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ (۲۲)

اور اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ تم اگر ان کو پکارو گے تو وہ

تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔ اور جو سنتے بھی تو جواب نہ دیتے اور قیامت کے دن تمہارے شرک کا انکار کر دیں گے۔

اس انکار کی کیفیت قرآن نے کئی جگہ بیان کی ہے۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُوا

مِنْ دُونِكَ۔ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ (۱۴)

اور جب مشرکین (میدانِ حشر میں) اپنے شرکاء کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ اے ہمارے رب یہی وہ شرکاء

ہیں جن کو ہم تیرے سوا پکارتے تھے۔ وہ (شرکاء) ان کو جواب دیں گے کہ تم بالکل جھوٹے ہو۔

دوسری جگہ ہے۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ

فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ۔ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ (۱۰)

اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے تو مشرکوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء اپنی اپنی جگہوں پہ ٹھیرو۔ پھر ان کے باہمی تعلقات کو ہم زائل کر دیں گے۔ ان کے شرکاء کہیں گے کہ تم ہم کو نہیں پوجتے تھے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ شہادت کے لئے کافی ہے کہ ہم تمہاری پرستش سے بالکل بےخبر تھے۔

ان آیات سے جہاں اس امر کا بین ثبوت ملتا ہے کہ معبودانِ غیر اللہ مردہ اولیاء اور بزرگانِ دین ہی ہیں، جن کو لوگ مقبولانِ بارگاہ اور صاحبانِ قدرت سمجھ کر اپنی مشکلوں اور حاجتوں میں پکارتے ہیں وہاں یہ بھی تصریحاً ثابت ہوتا ہے کہ تمام مردے[1] جو برزخ میں ہیں اُن میں نہ علم ہے نہ احساس ہے نہ شعور ہے نہ سماعت ہے اور بالکل غافل اور بےخبر ہیں۔ اور حشر میں اپنے پوجنے اور پکارنے والوں کو صاف جواب دیدیں گے کہ ہم کو نہ تمہاری پرستش کی خبر تھی نہ تمہاری پکار کی۔

اب یہ مصیبت اور عذاب جو مسلمانوں پر نازل ہو رہا ہے اس سے سچے موحدوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ امت کا رشتہ اللہ سے ٹوٹا ہوا ہے۔ اس لئے اس شرک کو جو اکبر الکبائر ہے امت سے دور کرنا اور کلمۂ توحید کے اقرار کرنے والوں کو اکیلے اللہ کا فرماں بردار بنانا ضروری ہے۔ اور قبر پرستی، تعزیہ پرستی، امام پرستی، اولیاء پرستی ملا پرستی اور پیر پرستی وغیرہ ہر قسم کے شرکیہ رسوم کو جو عوام مسلمانوں نے اختیار کر رکھی ہیں مٹانا لازم ہے۔ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ ہر مسلمان کو قرآن کی تعلیم دی جائے۔ کیونکہ یہی کتاب ہے جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ اگر مسلمان نے اس کو نہ سمجھا اور عمل نہ کیا تو اس کو نجات کی امید کم رکھنی چاہئے۔ عالم اور فقیہ، ملا اور پیر صرف ہمارے معلم ہو سکتے ہیں ہادی اور رہبر نہیں ہیں۔ ان سے قرآن کی تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے لیکن بلا قرآنی سند کے خود ان کی کوئی تعلیم دینی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ شخصیت پرستی ہے جو شرک ہے۔

---

[1] ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ شہداء یعنی مقتولین فی سبیل اللہ برزخ میں نہیں رکھے جاتے۔ بلکہ جان نکلنے ہی کے ساتھ ان کو زندگی ملتی ہے اور وہ اپنے رب کی حضوری میں یعنی جنت میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ مگر وہ بھی اس زمین کے لوگوں کی پکار نہیں سنتے نہ ان کی پکار کا جواب دیتے یا مدد کرنے کی قدرت رکھتے۔

دوسری خرابی جو ملت میں پیدا ہوئی وہ یہ ہے کہ اخوت اسلامی اور باہمی مساوات مٹ گئی ہے۔ اللہ نے جملہ مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا ہے اور قرآن میں فرمایا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ مسلمان تو سارے آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

جس طرح اسلامی اخوت نسلی، لسانی اور ملکوں کی جغرافی حدود سے بالاتر ہے اسی طرح اس میں دولت و غربت کا بھی امتیاز نہیں۔ سب آپس میں مساوی اور برابر ہیں، سب کے حقوق ایکساں ہیں۔ بزرگی اور شرافت کا مدار خود انسانوں کے ذاتی عمل اور تقوٰی پر ہے۔ جو متقی اور صالح العمل ہو وہ بزرگ ہے خواہ غریب ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن مسلمانوں میں بادشاہت، ریاست، جاگیرداری اور تعلقہ داری نے جو مدتہائے دراز سے چلی آرہی ہیں امیر و غریب اور شریف و رذیل کے طبقات بنا رکھے ہیں جس سے اسلامی اخوت مٹ گئی ہے اور متفقہ قوت ٹوٹ گئی ہے۔

اس مصیبت اور ابتلائے عام میں ہر مسلمان کو سمجھنا چاہیے کہ اللہ نے جس طرح ایک باپ کے دو بیٹوں کو بھائی بنا دیا ہے اسی طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا ہے خواہ وہ کسی ملک، کسی نسل اور کسی قوم کا فرزند ہو۔ مختلف ملکوں یا مختلف نسلوں یا مختلف پیشوں سے اللہ کی بنائی ہوئی اس برادری میں فرق نہیں آتا کیونکہ کلمہ پڑھ لینے کے بعد ہر آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل اور آپ کا معنوی فرزند ہو جاتا ہے۔ یوں تو سرور عالم کسی مرد کے باپ نہ تھے جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے۔

لیکن اس سے جسمانی باپ مراد ہے۔ ورنہ آپ ساری امت کے جو قیامت تک ہوگی روحانی باپ ہیں، اور آپ کی ازواج مطہرات ساری امت کی مائیں۔ اس طرح ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ اخوت کا رشتہ روحانی ہے جو اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس کو جسمانی رشتہ سے کم مقدس نہیں سمجھنا چاہیے۔

پہلی خرابی دینی ہے جس سے توحید الٰہی مٹ گئی جس پر اسلام کی بنیاد ہے۔ اور دوسری خرابی تمدنی ہے جس سے وحدتِ امت جاتی رہی جو اسلام کی اصلی طاقت ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کو ان خرابیوں کی اصلاح میں پوری قوت کے ساتھ کوشش کرنی چاہیے۔

اقبال اکادمی

پاکستان کے پہلے بجٹ میں محترم وزیرِ خزانہ نے ۱۹۴۸-۴۹ء کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی رقم بدیں غرض منظور کی ہے کہ اقبال اکادمی کا قیام عمل میں لایا جاسکے۔ وزیرِ خزانہ نے یہ پیشکش کرتے ہوئے کہا:۔

اس شخص کی یاد میں جس نے عہدِ حاضر میں، فکرِ اسلامی میں انقلاب بپا کردیا، جس نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم پھر سے ماضی پر فخر کرسکیں اور مستقبل سے پُرامید ہوسکیں، جس نے ہمیں قومی وراثت، ثقافت اور مقصد کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، وہ پہلی شخصیت جس نے پاکستان کا تصور پیدا کیا، میری مراد علامہ اقبال سے ہے، ان کی یاد میں میں نے آئندہ سال کے بجٹ میں ایک لاکھ روپے کا پہلا عطیہ شامل کیا ہے۔ تاکہ ایک اکادمی قائم کی جائے جو ان کے نام سے منسوب ہو۔ یہ تفصیلات کہ یہ رقم عملاً کیسے خرچ کی جائے ایوان کے مشوروں سے طے پائیں گی۔

← ہمیں خوشی ہے کہ حکومت نے ایک اہم ملی فریضہ کی طرف توجہ دی۔ ہم اشاعت ماسبق میں، وزیرِ خزانہ کی اس تجویز پر ہدیہ تبریک پیش کرچکے ہیں۔ ہم اس تجویز کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہوئے چند گذارشات ضروری سمجھتے ہیں۔

اقبال کی عظمت الفاظ اور یادگاروں سے ماوراء ہے۔ تبوّغ انسانی (human Genius) بہت کم اتنی دریادلی سے کام لیتا ہے۔ اقبال ان چند نابغات سے ہے جو ارتقائے ذہنِ انسانی کی شاہراہ پر یقینی سنگہائے میل ہیں۔ مسلمانوں میں اقبال کی شخصیت اس اعتبار سے اور ممتاز ہوجاتی ہے کہ اس کا سرچشمۂ فکر قرآن تھا۔ قرآن کی "مئے بے دُرد و صاف" میں جس بے دردی سے انسانی خیالات کی رنگ آمیزی کی گئی ہے اس نے قرآن کو قرآن نہیں رہنے دیا تھا۔ اتنی عظیم الشان آلائش سے آب مصفا

منقطر کرلینا کسی اقبال کا ہی کام ہو سکتا تھا۔ اقبال کا کلام قرآن ہی کا ترجمان ہے اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک۔

اقبال چاہتے تو اظہار مافی الضمیر کا کوئی اور وسیلہ بھی اختیار کر سکتے تھے مگر مزاج مشرق کو بخوبی پہچانتے ہوئے انھوں نے شاعری کو ذریعہ بیان بنایا۔ چونکہ فطرت کی کرم گستریوں نے طبع میں موزونیت نہایت بلند ودیعت کی تھی اس لئے وہ اپنی مخصوص اور غیر معمولی افتادِ طبع سے اس میدان میں دیگر رفقاءِ شعر کو ہزاروں فرسنگ پیچھے چھوڑ گئے۔ چنانچہ محض شاعری کی جہت سے مطالعہ کیا جائے تو کلام اقبال چاشنی اور لطافت میں بے نظیر اور یکتا ہے۔ شاعری کو اظہارِ بیان کا ذریعہ اختیار کرتے ہوئے اقبال بے خبر نہ تھے کہ طبع مشرق ذریعہ کو مقصود سمجھ لینے پر مجبور ہوگی۔ چنانچہ انھوں نے قدم قدم پر یہ یاددہانی کرائی کہ ان کا مقصد شاعری نہیں بلکہ وہ اس موہبتِ عظمیٰ کو جہان چارسو میں عام کر دینا چاہتے ہیں کہ جس کا مہبط ان کا قلب ہے۔ انھیں کئی بار اعلان کرنا پڑا کہ انھیں شاعر کہنا ان پر تہمت لگانے کے مترادف ہے۔ انھوں نے بارہا تردید کی کہ وہ شاعر نہیں۔ انھوں نے 'حضورِ رسالت' شکایت کی:

من اے میرِ امم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

لیکن ستم ظریفی ملاحظہ کیجئے، یار لوگوں نے اقبال کو غزل خواں ہی سمجھا، مصافِ زندگی میں "لہو ترنگ" سے گریز کر کے "نوائے چنگ" کے طلب کرنے والے شعر و سخن کی رنگینیوں سے آگے نہ نکل سکے چنانچہ یہ رنجدہ حقیقت ہے کہ اقبال کو شاعر ہی سمجھا جاتا ہے اور شاعری کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے، اقبال کے اٹھ جانے کے بعد جو کچھ اقبال کے متعلق کہا یا لکھا گیا ہے اسے ایک نظر دیکھ لینے سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک مرحوم شاعر کا تذکرہ ہے جس کی طبیعت دقیانوسی بحور و عروض میں مقید رہی اور جو گل و بلبل کی سطحی اور بے معنی تشبیہات تک محدود رہا۔ البتہ غور و سوز دروں سے اس کے کلام میں لذت مقابلتاً زیادہ ہے۔ کسی نے اس سے زیادہ اقبال فہمی کا ثبوت دیا تو ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت کا حوالہ دیدیا کہ جس میں پاکستان بحیثیت ایک سیاسی تصور کے پیش کیا گیا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جو اقبال سے شغف

پیدا ہوا ہے تو اس کا مظاہرہ یوں دیکھنے میں آرہا ہے کہ بعض فلمی گیتوں کی جگہ اقبال کے شعروں نے لے لی ہے یا بعض ریڈیو آرٹسٹ اپنے فن کی مشق علامہ مرحوم کے اشعار پر کرتے ہیں۔ اس سطح بینی اور کور نگہی کا ثبوت اس قوم کی طرف سے مل رہا ہے جسے اقبال نے زمانہ کی تقدیریں بدلنے کے لئے منتخب کیا تھا۔

یہ عظیم الشان لغزش امر اتفاقی نہیں بلکہ اس سطحیت اور عامیت کی مظہر ہے جس کے ہم زبوں صید اور دیرینہ شکار ہیں۔ اس پس منظر میں محترم وزیر خزانہ کی اقبال اکادمی کی تجویز، ہمیں اندیشہ ہے کہ اس سے آگے نہیں بڑھے گی کہ اقبال کے کلام کے حسین و جمیل اڈیشن سرکاری طور پر شائع کردیئے جائیں، جو ان جملہ محاسن ظاہری سے مزین ہوں جو افراد قلتِ ذرائع کے باعث پیدا نہ کرسکے، یا اشعار اقبال کے تراجم شائع کرادیئے جائیں یا رسمی محفلیں منعقد کرنا شروع کردی جائیں جو اقبالی مشاعروں کی حد سے آگے نہ بڑھیں۔ یا پھر ریڈیو یا دیگر سرکاری ذرائع سے کلام اقبال کو نشر کردیا جائے۔ یہ یا اس قسم کے دیگر اقدامات نہ اقبال کی روح کے صحیح پیکر بن سکتے ہیں نہ ان کی بہترین یادگار قرار پاسکتے ہیں۔ ان کی حقیقی یادگار یہی ہے کہ استخواں کو چھوڑ کر مغز کو اجاگر کیا جائے۔ الفاظ کی حدود سے نکل کر معانی کی پربہار وادیوں میں گلگشت کی جائے اور الفاظ اشعار کی بجائے روحِ اشعار کی تبلیغ کی جائے۔

اگر حکومت کے پیش نظر فی الواقع یہ مقصد ہے کہ اقبال کی تعلیماتِ اصلی کو پھیلایا جائے تو پامال راہوں سے ہٹ کر نئی اور صحیح راہوں پر چلنا چاہیے۔ اقبال کا سمجھنا اور سمجھانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں جیسا کہ ہم نے لکھا ہے اقبال کا سرچشمۂ تخیل قرآن ہے، لہٰذا ان کا کلام قرآن ہی کی تفسیر ہے۔ چنانچہ کلام اقبال کی تفہیم کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اصل یعنی قرآن کو کماحقہ، سمجھا جائے۔ قرآن کا سمجھنا ہمارے ہاں ایک اور مشکل ہے۔ ہم نے اس گل خوش رنگ کے گرداگرد کانٹوں اور جھاڑیوں کی وہ گھنی باڑ لگا دی ہے کہ اس کا نظارہ امر دشوار ہوگیا ہے۔ جب تک یہ خارزار بالکلیہ صاف نہیں ہوجاتا ہم برای العین اس گل سرسبد کو جنت نگاہ نہیں بنا سکتے۔ لیکن یہ کام ان کے سپرد ہرگز نہیں کیا جاسکتا جو کانٹوں اور جھاڑیوں سے ہراساں ہو کر اس پھول کی عدم موجودگی کے قائل ہوجائیں۔ یا ان کانٹوں ہی کو پھول سمجھ کر اپنے آپ کو بھی

فریب دے لیں اور دوسروں کو بھی اس فریب میں مبتلا ہو جانے کی دعوت دیں۔

ہمارے ہاں ایسے اصحاب بالکل مفقود نہیں جو اقبال سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اقبال اکادمی ان حضرات کے سپرد کی جاسکتی ہے۔ وہی تعلیماتِ اقبال کو صحیح خطوط پر پھیلا سکیں گے۔ اقبال اکادمی اسی صورت میں مفیدِ ملت ثابت ہو سکتی ہے ورنہ ہر وہ صورت جو اس ضمن میں نکالی جائے گی ایک محفلِ اشعار سے زیادہ وقیع نہیں ہوگی۔ اگر محدود وطنی نقطۂ نظر سے بات کی جائے تو اقبال پاکستان کا بابائے قومیت Father of Nation ہے۔ لیکن یہ اندازِ گفتگو فکرِ اقبال کی تنقیص ہے۔ کیونکہ اقبال فکرِ اسلامی کے روحِ رواں ہیں۔ ان کے نام سے الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید کی جاسکتی ہے اور ملتِ اسلامیہ کی اسلامی خطوط پر تعمیرِ نو کی جاسکتی ہے۔ اقبال اکادمی بتدریج فکرِ اسلامی کی نمائندہ بن سکتی ہے اور حیاتِ اجتماعیہ میں حیاتِ نو کی ضامن۔ یہی اکادمی اُس فقہ جدید کو بھی مرتب کر سکتی ہے جس کا سرچشمہ قرآن ہو اور جس کی ترتیب کی خواہش اقبال کے قلبِ درد آگیں میں عمر بھر پہلو بدلتی رہی لیکن جو ناساعدت حالات کی وجہ سے مجسم پیکر میں سامنے نہ آسکی۔

لہٰذا ہم حکومت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اقبال اکادمی کی ترتیب و تشکیل کا فریضہ ان حضرات کے سپرد کرے جو اپنے علم و فضل کے لحاظ سے اس کے اہل ہیں اور اقبال کے منبع فکر یعنی قرآن کو خوب سمجھتے ہیں۔ ہم پورے زور سے درخواست کریں گے کہ اس اہم ملی ادارہ کو 'سرکاری' نہ بنا دیا جائے۔ ہم نے لفظ سرکاری کو واوین میں لکھا ہے۔ ادارہ بہرکیف سرکاری ہو گا لیکن ہماری مراد اس سے یہ ہے کہ اسے ویسا بے روح ادارہ نہ بننے دیا جائے جیسے عام طور پر سرکاری ادارے ہوتے ہیں، جو مشینی انداز سے چلتے ہیں مگر قلبِ انسانی کے ساتھ حرکت نہیں کرتے۔ اگر اسی طرح کا ادارہ قائم کر دیا گیا تو یہ بھی محض ایک میکانکی عمل بن کر رہ جائے گا، ایک مجسمہ بے جان۔

اس ضمن میں ایک اقبال لائبریری کی اشد ضرورت ہے جو تشنگانِ علم کی سیرابی کا باعث ہو۔ پاکستان کے مرکز میں اعلیٰ قسم کی لائبریری انتہائی ضروری ہے اور اقبال اکادمی کے قیام کے ساتھ اس کی ضرورت اور اشد ہو جائے گی۔ لہٰذا ہماری درخواست ہے کہ

(۱) ایک مرکزی اقبال لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے جو انڈیا آفس (لندن) کی لائبریری کی جانشین ہو

اور جملہ علوم و فنون سے متعلق ممکن ذخیرہ کتب (قدیم وجدید) اس میں موجود ہو۔

۲) اقبال اکادمی کا اہتمام و انصرام شیدائیانِ اقبال میں سے ان کے سپرد کیا جائے جو قرآن پر عبور رکھتے ہوں اور تعلیماتِ اقبال کو جامعیت سے سمجھتے بھی ہوں اور سمجھا سکنے کی اہلیتِ تامہ بھی رکھتے ہوں۔

← ایسی مکمل لائبریری کی موجودگی اور ایسی صحیح اکادمی کی نگرانی میں اقبال کا نورِ بصیرت شش جہات میں عام کیا جا سکتا ہے اور قرآن کا پیغام افرادِ ملت کے قلب کی گہرائیوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ اس سے آگے بڑھئے تو یہ ادارہ تمام عالمِ اسلامی کی فکری تعمیر و تطہیر کا موجب بھی بن سکتا ہے، نہیں بلکہ وہ اقوامِ عالم کی امامت کا ضامن بھی ہو سکتا ہے۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء۔

یہ ہوگی اقبال اکادمی کے حسین خواب کی سچی حقیقی تعبیر۔ ورنہ سب افسانہ و افسوں!

ترانۂ پاکستان

طلوعِ اسلام کی جنوری۔ فروری کی اشاعت میں ہم نے اسد ملتانی صاحب کا ترانۂ پاکستان بدیں مقصد شائع کیا تھا کہ اربابِ نظر اس کے متعلق اپنی آراء سے مطلع فرمائیں۔ اس سلسلہ میں دو مراسلات درج ذیل ہیں۔ مدیر

قیامِ پاکستان سے متفرق مسائل ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ پاکستان کا ترانۂ ملی کیا ہو۔ ہر آزاد ملک کا ایک نہ ایک ترانہ ضرور ہوتا ہے اور اب چونکہ پاکستان بھی آزاد ہو گیا ہے لہٰذا اس کا بھی دیگر ممالک کی طرح ایک ترانہ ہونا چاہیئے۔ یہ بظاہر ایک معقول بات ہے لیکن درحقیقت یہ خواہش ایک بنیادی غلطی کی غمازی کر رہی ہے۔ اس وقت کرۂ ارض قومی وحدتوں میں منقسم ہے۔ ہر قومی وحدت دوسری قومی وحدت سے جداگانہ اور الگ ہے اور اس کی جدوجہد کا مدار اس پر ہے کہ وہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے دوسری وحدت سے زیادہ سے زیادہ بے نیاز ہو۔ یعنی وہ ممکن طور پر خود کفیل - Self-sufficient ہو۔ اس خود کفالتی کے ہزار فوائد گنائے جانے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ اس سے وہ انسانی اثاثہ بھی ٹکڑیوں میں بٹ گیا ہے جو نوعِ انسانی کے لئے مشترک تھا اور جو جغرافیائی حدود سے کبھی مختص نہیں ہو سکتا تھا۔ مثلاً اثاثہ تاریخ کو لیجئے۔ اب تاریخ، بجائے اس کے کہ وہ نوعِ انسان کے تجربات کی حیثیت سے سامنے آئے، تاریخ انگلستان، تاریخ یونان، تاریخ روس کی حیثیت سے مشہور ہوتی ہے۔ ہر قوم ان اجزائے مخصوصہ پر تفاخر کرتی ہے اور اپنی عظمت و برتری کے گیت گاتی ہے۔ اس ماضی کے ساتھ حال و استقبال کی خوش خیالیاں اور جمع ہو جاتی ہیں اور اس قومی و وطنی تفاخر کا ملیک پہلو قومی ترانہ کہلاتا ہے۔ قومی ترانہ شاندار ماضی اور خوش آئند مستقبل کے علاوہ حقیقی یا فرضی قومی مقاصد (مزعومہ) اور بعض صحیح یا غلط مقامی

خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ وطنیت (اور بعض ممالک مثلاً انگلستان وغیرہ کے نزدیک) شہنشاہیت یا بعض مقامات پر دونوں، لات و منات ایسے مرکزی نقطے بن جاتے ہیں کہ قوموں کی حیات انہی کے گرد گھومتی ہے۔ چنانچہ قوموں کے ترانے اسی "فکر و نظر" کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

قومی ترانے عموماً سازوں پر گائے جاتے ہیں اور ان کے الفاظ کو صوتی یا موسیقی کے خطوط میں مرتسم کر لیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ الفاظ کی بجائے سُر ہی کانوں سے مانوس ہو جاتی ہیں اور ان سُروں کو قومی ترانہ فرض کر لیا جاتا ہے۔ دیگر ممالک بالخصوص، ممالک مغرب میں مخصوص قومی زندگی کے پیش نظر ایسے مواقع شاذ و نادر ہی آتے ہیں کہ قومی ترانوں کو الفاظ کی صورت میں ادا کیا جائے۔ ان کے ہاں صرف ایسے مواقع آتے ہیں کہ ترانوں کو خطوطِ موسیقی کی مدد سے سازوں پر گایا جاتا ہے۔ یہ ترانے بین الاقوامی اجتماعات میں بھی رسماً گائے جاتے ہیں۔ ایسے اجتماعات میں ترانے کے حسن و قبح کا انحصار موسیقیت پر ہوتا ہے نہ کہ الفاظ و معانی پر۔ کیونکہ ساز پر گائے جانے کی صورت میں نہ الفاظ کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ کہ معانی کی احتیاج۔ اور موسیقیت میں اس ضرورت کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ وہ بین الاقوامی اعتبار سے پسندیدہ اور جاذب گوش ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان کا مطالبہ "ترانہ" کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر اس کا مفہوم یہی ہے کہ دیگر اقوام و ممالک کی طرح پاکستان کا بھی ایک وطنی ترانہ ہو تو یہ بنیادی طور پر غلط مطالبہ ہے۔ پاکستان جن اصولوں کے تحت عمل میں لایا گیا ہے اور جن اساسات پر اس کا نظامِ حکومت استوار کرنے کے لئے نیک ارادے قلوب میں مضطرب ہیں وہ ہرگز ایسے ترانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ قومی یا وطنی ترانہ ان اصولوں کی تردید ہے۔ پاکستان ہر چند ایک جغرافیائی وحدت ہے، لیکن قومیت اسلام، جغرافیہ کے اصولوں سے بلوری ہے۔ اس کی اساس، فطرت انسانی پر ہے اور فطرت مقامی اور تنگ نظر ترانوں کی روادار نہیں ہو سکتی۔ اگر پاکستان بطور ایک جغرافیائی مملکت کے قائم کیا گیا ہے اور پاکستانی ایک جداگانہ قومیت، یعنی سیاست حاضرہ کی عام اصطلاح میں نیشن Nation ہے تو پھر قومی ترانے کا مطالبہ قابلِ فہم ہے۔ اس صورت میں اس کی قومیت کے گیت گائیے، اس کے امیر کے قصیدے پڑھئے، پہاڑوں کی عظمت کا تذکرہ کیجئے، دریاؤں کی روانیوں کی داستانیں بیان کیجئے، اور اس کے صحراؤں اور مرغزاروں کے مبالغہ آمیز چرچے کیجئے۔ لیکن

اگر اس کے برعکس پیشِ نہاد اسلام اور قرآن ہے تو لامحالہ اس نظریہ میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی پڑیگی۔

اسلام کا ترانہ قومی اور وطنی نہیں ہو سکتا، وہ ہمہ گیر اور عالمگیر ہو گا۔ چونکہ اسلام کا ترانہ قومی نہیں ہو سکتا اور پاکستان اپنی اساس اسلام پر استوار کرنے کا دعویٰ لئے ہوئے ہے لہٰذا کوئی قومی ترانہ پاکستان کا ترانہ قرار نہیں پا سکتا۔ پاکستان کا ترانہ اسلامی (ملی) ترانہ ہو گا، جو قومی تفاخر اور وطنی تعلی سے مبرا ہو گا۔ وہ ان مقاصد کا حامل ہو گا جو انسان گیر ہوں گے۔ وہ اس مشن کی ترجمانی کرے گا جو کرۂ ارض پر انسان کے پیشِ نظر ہے۔ خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کی حیثیت سے اس پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں وہ انہیں نظرانداز نہیں کر سکتا، اور ہر وقت ان کی یاددہانی کرتا رہے گا۔ اس کا ترانہ ایسا ہی تذکرۂ جلیلہ ہو گا۔

اس پس منظر میں کوئی ترانہ ہماری ضرورت پوری نہیں کر سکتا الا ترانۂ ملی کہ جو خالقِ پاکستان علامہ اقبال مرحوم نے ملت کو دیا۔ تخلیقِ پاکستان کو آج تک اس سے بہتر اور صحیح انداز سے کوئی اور پیش نہیں کر سکا۔ یہ ترانہ پوری ملتِ اسلامیہ کا ترانہ ہو سکتا ہے۔ البتہ اسے مقامی رنگ دینے کے لئے۔ اور وہ بھی اس غرض سے کہ اس ترانہ میں جن مقاصد و عزائم کا ذکر ہے ان سے پاکستان پوری وابستگی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ مناسب معلوم ہو کہ اسے پاکستانی بنا لیا جائے یعنی لفظی اعتبار سے مناسب جگہوں پر ایسی تبدیلیاں کر لی جائیں جن سے یہ ترانۂ پاکستان کہلا سکے۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے کلام میں مناسب و موزوں تبدیلی کا حق ہر کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کام انہی کا ہو سکتا ہے جو ان اصولوں سے اتفاق کریں۔ یہ اتفاق ذہنی نہیں ہونا چاہیے بلکہ قلبی ہونا چاہیے۔ نیز ان کا پایہ شاعرانہ اعتبار سے عام سطح سے بلند ہو۔ میں ایسے ذمہ دار، خوش ذوق اور اہل حضرات سے درخواست کرونگا کہ وہ ان اشارات کے مطابق طبع آزمائی کریں۔ لیکن یہ ضرور خیال رہے کہ اقبال کے کلام کو اس بہانہ سے بازیچۂ اطفال نہ بنا لیا جائے۔

ملی ترانہ کے لئے موسیقی کا مسئلہ اہم ہے خصوصیت سے اس ضرورت کے تحت کہ وہ بین الاقوامی اجتماعات میں گایا جائے گا۔ لیکن ہمیں اس ضمن میں چنداں کاوش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اقبال کی شعریت میں موسیقیت اسی طرح مضمر ہوتی ہے جس طرح بربط کے تاروں میں نغمات۔

(رشید اختر)

(۲) طلوعِ اسلام بابت جنوری - فروری ۱۹۴۸ء میں جناب اسد ملتانی کا لکھا ہوا "ترانۂ پاکستان" شائع ہوا ہے۔ جناب نے اس کے متعلق اربابِ نظر سے اظہار آرا کے لئے فرمایا ہے۔ مجھے اہلِ نظر ہونے کا دعویٰ نہیں تاہم اپنی ناچیز رائے کے اظہار کی جراُت کرتا ہوں۔

میں اسد صاحب کے اس نظریہ سے کہ قومی ترانہ عام فہم اور آسان ہونا چاہیے صرف متفق ہی نہیں ہوں بلکہ اس کی پرزور تائید کرتا ہوں۔ قومی ترانہ ایک قوم کی اُن روایات اور Ideals کا آئینہ دار ہونا چاہیے جن کی وہ قوم حامل ہو۔ جب قومی ترانہ پڑھا جائے تو ہر پڑھنے اور سننے والے کی آنکھوں کے سامنے ان Ideals کا نقشہ پھر جائے اور اس کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہر پڑھنے اور سننے والا اُس ترانے کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔ اور یہ جب ہو سکتا ہے کہ ترانہ عام فہم زبان میں ہو۔

قومی ترانہ کے لئے ایک اور شرط یہ ہے کہ اُس کے ہر لفظ میں پائندگی پائی جائے۔ قومی ترانے کا تعلق قوم کی زندگی سے ہے۔ جب تک قوم زندہ ہے اس کا ترانہ کسی تغیر و تبدل یا صحت و درستی کا محتاج نہ ہو، اس لئے ترانہ یا اُس کا کوئی حصہ ایسا نہ ہو جس کا تعلق حال سے ہو اور کچھ مدت کے بعد بے معنی ہو کر رہ جائے۔

قومی ترانہ کے لئے ایک اور ضرورت یہ ہے کہ قوم کے ہر فرد کو جب وہ اُسے پڑھے یہ محسوس ہو کہ یہ اُس کا اپنا ترانہ ہے۔ یہ اُس کے اپنے خیالات کا نقشہ ہے۔ اُسے یہ محسوس نہ ہو کہ وہ کسی اور کے الفاظ اپنی زبان پر لا رہا ہے۔

اسد صاحب کے ترانہ کے پہلے شعر میں پائندگی نہیں۔ اس شعر میں حضرت قائدِ اعظم کی سلامتی کے لئے دعا ہے۔ اللہ انھیں ہمیشہ سلامت رکھے۔ لیکن قدرت کا قانون اٹل ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت موصوف کی حیات مبارک کے بعد (حاکم بدہن) یہ شعر بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ ہاں اگر قائدِ اعظم کا لقب پائندہ ہوتا اور ہر امیرِ پاکستان کو دیا جا سکتا تو اس شعر میں ہرج نہیں تھا۔ جیسا کہ انگلستان کے قومی ترانہ "God save the King" میں 'King' سے مراد بادشاہِ وقت ہے چاہے کوئی ہو۔

اسی طرح آخری شعر میں شاید شاعر کا اشارہ پاکستان کے موجودہ دشمنوں کی طرف ہے۔ چنانچہ جب ان دشمنوں کی چالیں یا جب یہ دشمن خود ختم ہو جائیں گے تو یہ شعر غیر ضروری ہو جائے گا۔ اسی شعر میں ایک اور بات کو

میں قابلِ اعتراض سمجھتا ہوں۔ شاعر کو ترانہ میں اپنا تخلص استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ شاعر اپنا تخلص کسی وجہ سے بھی استعمال کریں ترانہ کے اشعار میں تخلص سے شاعر کا اشعار پر حقِ ملکیت ظاہر ہوتا ہے۔ قومی ترانہ قوم کا ترانہ ہوتا ہے اور وہ کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں ہو سکتا۔

جس شاعر کا لکھا ہوا ترانہ بالآخر پاکستان کا قومی ترانہ قرار پائے گا یقیناً اس شاعر کا نام پاکستان کی تاریخ کے پہلے باب میں لکھا جائے گا۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟

"ترانۂ پاکستان" کے باقی سب اشعار نہایت حسین ہیں اور واقعی قومی ترانہ میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کے مسلمانوں کو اس کام کے لئے چُنا ہے کہ وہ بھٹکی ہوئی دنیا کو پھر ایک بار وہی پیغام دیں جسے سرورِ کائنات ؐ نے تیرہ سو سال پہلے دیا تھا اور جسے کافی عرصہ ہوا دنیا بھول چکی ہے۔ اس لئے موزوں ہوگا کہ پاکستان کا قومی ترانہ اہلِ پاکستان کو یہ بھی یاد دلائے کہ اُسے دنیا کو کیا پیغام دینا ہے۔ اس موضوع پر ایک آدھ شعر ضرور ترانہ میں شامل ہونا چاہیے۔

(میجر) محمد نواز ملک

پاکستانی اچھوت

چیف کورٹ (کراچی) کی عمارت میں مرکزی حکومت کے کچھ دفاتر ہیں۔ ان دفاتر میں ایک بڑے دروازے کے باہر ایک بورڈ آویزاں ہے جس پر لکھا ہے۔

یہ راستہ صرف افسران کے لئے ہے

یعنی "اچھوت بابوؤں" کو اس مقدس دروازہ سے گذرنے کی اجازت نہیں۔ انگریزی کی دفتری حکومت میں افسر اپنے آپ کو ایک جداگانہ "برادری" سمجھا کرتے تھے۔ جس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ہر غیرافسر کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ ہم نے سمجھا تھا کہ انگریز کے چلے جانے سے یہ لعنتیں بھی دور ہو گئی ہوں گی لیکن معلوم ہوا کہ رسی کے جلنے کے بعد بھی اس کے بل قائم رہتے ہیں!

حیرت ہے کہ انسان کب تک ان غیرانسانی حرکات کو جاری رکھیگا۔ اور اس سے بھی بڑی حیرت یہ کہ انسان ان حرکات کو کب تک برداشت کئے جائے گا۔

مسکیں و ظلم ماندہ دریں کشمکش اندر!!

طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

سابقہ اشاعت میں "محاسبہ نفس" کے تحت ہم نے ختم کلام کے طور پر اس بدیہی حقیقت پر زور دیا تھا کہ نفسیاتی طور پر قوم کا اعتماد استحکام حکومت کے لئے ضروری چیز ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ بعض راز ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں عوام پر افشا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس قسم کی پردہ داری حالتِ جنگ تک محدود ہوتی ہے۔ جنگ یا اس قسم کے واقعات کے بعد یہ راز، راز نہیں رہتے۔ اُس وقت ان مصالح کا اخفا قوم کے تحت الشعور میں عدم اعتماد کی ایک پھانس بن کر کھٹکتا رہتا ہے اور یہی پھانس بالآخر اہم انقلابات کا موجب بن جاتی ہے۔

پاکستانی پارلیمان میں پہلے پاکستانی بجٹ پر بحث کا جواب دیتے ہوئے پاکستان کے پہلے وزیر خزانہ نے پہلی مرتبہ ایک ایسے راز کی طرف اشارہ کیا۔ پاکستان کی مالی تنگدستی کا ذکر کرتے ہوئے جناب غلام محمد نے کہا:۔

> پاکستان جس مالی بحران سے دوچار ہوا ہے، تمام تاریخ انسانی میں کوئی کابینہ، کوئی حکومت قیام کے فوراً بعد ایسے بحران سے دوچار نہیں ہوئی۔ . . . . . . قوم کو معلوم نہیں کہ ۱۵ اگست کے بعد کابینہ اور حکومت کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ہم نے قوم اور حکومت کے مابین جس خلا کا ذکر کیا تھا وزیر خزانہ نے اسے تسلیم کیا ہے۔ آپ نے اس اعتراف کو بطریقِ استدلال پیش کیا ہے اور مخالفین کو اس سے لاجواب کرنا چاہا ہے حالانکہ ضرورت مخالفین کی زبان بند کرنے کی نہیں بلکہ موافقین کے اطمینانِ قلب کی ہے۔

خلا کے ضمن میں اولین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خلا موجود کیوں ہے، یعنی اس کی علت کیا ہے؟ ہماری سیاسی تاریخ عصر قریب و بعید سے اس سوال کا مکمل جواب مہیا کرتی ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پیشتر ہم

انگریز کے غلام تھے جس نے ڈیڑھ سو دو سو سال تک اپنے قومی مصالح کے ماتحت ہم پر حکومت کی۔ سیاسی استیلا اور اقتصادی استحصال بالجبر، استعمار و استبداد کے لازمی نتائج ہوتے ہیں۔ اجنبی حکومتیں اپنے مخصوص وطنی مصالح کو پیشِ نظر رکھتی ہیں اور ان سیاسی محرکات پر کاربند ہو کر نظامِ حکومت قائم کرتی ہیں جو انسانوں کو وادیٔ انسانیت سے نکال کر حیوانوں کے گلے میں دھکیل دیتے ہیں اور انھیں اشرف المخلوقات کے مقامِ بلند سے گرا کر دیگر "مسخراتِ کائنات" کے مقامِ پست پر لے آتے ہیں۔ انسان بالفطرت آزاد واقع ہوا ہے۔ آزادی اس کی فطرتِ صحیحہ کا خاصہ ہے۔ وہ جب غلام بنتا ہے اور غلامی پر رضامند و قانع ہو جاتا ہے تو اس کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔ غلامی اور مسخِ فطرت لازم و ملزوم ہیں۔ غلامی مسخِ فطرت میں ممد ہوتی ہے اور مسخِ فطرت غلامی کو استحکام بخشتا ہے۔ استبدادی قوت اسی دَوری تعلیل (Circuler Causation) سے فائدہ اٹھاتی ہے اور اپنے خونی پنجے غلام قوم کی رگِ جان میں اور مضبوطی سے پیوست کرتی جاتی ہے۔

جیسے انسان بالفطرت آزاد ہے اسی طرح وہ مدنی الطبع Gregareous واقع ہوا ہے۔ مدنیت میں انسان انسان سے اشتراکِ عمل کرتا ہے اور اپنی بعض مدنی۔ اجتماعی۔ ذمہ داریاں تقسیمِ کار کے طور پر اپنوں میں سے بعض کے سپرد کر دیتا ہے (اولی الامر منکم)۔ یہی مدنیت آزمایش و تجربہ کی ان گنت وادیوں سے گذرتی، ارتقائی مراحل طے کرتی منظم اور جمہوری حکومت میں شکل پذیر ہوتی ہے۔ **منظم اور جمہوری!** اس لئے کہ نظم و جمہوریت مدنیت کی یقینی بنیادیں ہیں۔ انسانی اجتماع و مدنیت "نظم و جمہوریت" کے بغیر جسدِ بیہودہ اور جسدِ بے روح ہے۔ انسان جب تک اپنے گرد و پیش نظم و ضبط نہیں پیدا کر لیتا وہ اطمینان و دلجمعی سے اظہارِ ذات و تسخیرِ کائنات کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ نظم و ضبط کے ساتھ ساتھ اسے اس اعتماد کی بھی اشد ضرورت ہے کہ اس نے اپنی آزادی پر جو اجتماعی پابندیاں لگائی ہیں وہ اسی کے مفاد کے لئے ہیں نہ کہ ان افرادِ منتخبہ کے شخصی تفوق کے لئے، جو اجتماعی حقوق و فرائض کے امین بنائے گئے تھے لیکن مرورِ زمانہ اور نشہ قوت نے انھیں اجتماعی خائن بنا دیا۔ جنھیں مشترک امورِ مہم کی بجا آوری کے لئے منتخب کیا گیا تھا اور وہ حاکم بن گئے۔ جنھیں متعلقہ گروہِ انسانی نے بغرضِ سہولتِ کار چند ذمہ داریاں تفویض کی تھیں اور اس گروہ کو قومی خدمت کی سعادت بخشی تھی، مگر انھیں ہوس جوئیوں نے اندھا کر دیا اور وہ مخدوم بن بیٹھے۔ وہ مخدوم کیا بنے گروہِ انسانی کے جسم و ذہن کے مالک

بن بیٹھے۔ یہ انسان خوار، انسانی قابوس تاریخِ انسانی کے صفحے صفحے پر ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ تڑپتی لاشیں ان کے ساز استبداد کی لرزاں تاریں ہیں۔ اور پامال و مظلوم انسانوں کی آہیں، چیخیں، کراہیں ان کے آہنگِ رقص کا زیر و بم۔

یہ طائفہ استبداد، قیاصرہ و فراعنہ کی شکل میں آیا یا احبار و رہبان کے لباس میں، اس نے انسان کو نہ محض جسمانی طور پر روندا بلکہ ذہنی طور پر بھی اسے ماؤف کیا۔ جسمانی خدمت تو بالآخر جسم سے ہی متعلق تھی اس کا اثر، جتنبر جسمانی اور کمتر ذہنی، زائل کیا جا سکتا تھا اور انسان کو پھر سے اس کے مقام پر فائز کیا جا سکتا تھا لیکن ذہنی و فکری استیلا نے انسان کو انسانوں کے درجے سے گرا دیا اور حیوانات و جمادات تک پہنچا دیا۔ اب ہر چند وہ استبداد ملوکانہ بہ اشتبداد دیرینہ موجود نہیں اور انسان ایک حد تک اس قابوسِ ذہنی کے چنگل سے نجات پا چکا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ نجات ہنوز سطحی ہے۔ یہ بالائے آب نرم و نازک ہوا کی پیدا کردہ خفیف لرزشیں ہیں۔ زیرِ سطح وہی سکوت و جمود ہے۔ انسان کا تحت الشعور ہنوز اسی تاریکی کی آماجگاہ ہے۔ حریت، مساوات، اخوت کے نعرے لگانے والے ابھی ان کے معانی سے کاملاً آشنا نہیں ہوئے۔ ہنوز یہ سربستہ راز ہیں — انسانی تحت الشعور کی ظلمت میں حریتِ فکر کا آفتاب ابھی ضوفگن نہیں ہوا۔ یہ تاریک خانہ ابھی تک ذہنی چمگادڑوں سے معمور ہے۔ انسانی فکر کا شہباز ان فضاؤں اور وادیوں میں پرفشاں نہیں ہوا۔

انگریز ہماری شب غلامی میں انہی چمگادڑوں سے کام لیتا رہا۔ یہ تو خیر قابلِ فہم تھا۔ لیکن اب؟ اب تو ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہم نور کی وادی میں ہیں! دولت خداداد پاکستان! ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی دہ سالہ جد و جہد کا ثمرہ، پاکستان! شرعی نظامِ حکومت کی تجربہ گاہ، پاکستان! اب ہم آزاد ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء پاکستان کا یوم پیدائش اور ملت کا یومِ آزادی ہے۔ اب ہماری اپنی حکومت ہے، استبداد و جبر کی کارفرمائی نہیں رہی۔ یہی قائدِ اعظم ہماری محبوب واحد نمائندہ مسلم لیگ کے صدر، ہمارے گورنر جنرل ہیں۔ یہی لیاقت علی خاں، اسی مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری، ہمارے وزیر اعظم ہیں۔ پاکستان کی حکومت اسی مسلم لیگ کی مرتب کردہ ہے۔ اس مسلم لیگ کی حکومت جسے ہم واحد نمائندہ جماعت سمجھتے تھے۔ نہ محض خود سمجھتے تھے بلکہ دوسروں سے منواتے تھے۔

۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک انگریز اور ہندو سے جب بھی گفتگوئے مصالحت کا موقع آیا ہم نے اولین مطالبہ

یہی پیش کیا کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے اور پھر اس سے آغازِ گفتگو کیا جائے۔ اسی نمائندہ حیثیت کو ہم نے ۱۹۴۵ء کے انتخاباتِ عامہ کے معرکہ میں فوق العادہ سرگرمی کا مظاہرہ کرکے اور دشمنانِ ملت کو خاسر و ناکام بنا کے اغیار سے منوایا۔ لیکن اب جبکہ وہی جماعت اقتدار و حکومت کی امین بن گئی ہے تو ملت اور ملت کے جمہوری نمایندوں میں یہ بُعد کیوں؟ یہ مغائرت کیوں؟ ملت کے ان دو معاون گروہوں میں اب پہلے سی رفاقت کیوں نہیں رہی؟

یہ 'بُعد' یہ مغائرت درحقیقت ہمیں ورثہ میں ملے ہیں۔ یہ تاریخی حقیقت ہے (ہرچند نہایت رنجدہ کہ ہماری حکومتیں صدیوں سے استبدادی و آمری ہو چکی تھیں۔ ہم صدیوں سے عوامی حکومتوں سے ناآشنا ہیں۔ انگریزوں کی عملداری سے قبل ہرچند ہماری حکومتیں اجنبی نہیں تھیں لیکن ان کی عدم اجنبیت صرف اسی حد تک تھی کہ وہ اسی خاک سے اٹھیں، یا اسی خاک میں مدفون ہوگئیں۔ اندازِ حکومت کے اعتبار سے وہ غیر عوامی اور غیر ذمہ دار تھیں۔ حکمران ملک و ملت کے سامنے جوابدہ نہیں تھے۔ ان کی حکومت کا نتیجہ تفوقِ ذات تھا اور شخصی اجارہ داری۔ یہ درست ہے کہ بعض یا بیشتر حکمران نیک دل اور بہی خواہ ملک تھے لیکن یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ سیاسی و آئینی نقطۂ نگاہ سے وہ غیر ذمہ دار تھے اور آمر مطلق۔ وہ عوام کے نمائندے نہیں تھے۔ اگر ان کے دم سے محکوم طبقہ کو چند فوائد حاصل ہوئے تو وہ ان کی خوبی ہے یا حسنِ اتفاق۔ انگریز کے آنے سے یہ سنت کہن بدستورِ سابق جاری رہی۔ اسے جاری رہنا ہی چاہئے تھا کیونکہ وہ ظاہر و باہر اجنبی، غیر ملکی، استعماری اور استبدادی حکومت تھی۔ اس وقت ہمیں 'برکاتِ انگلشیہ' سے بحث نہیں۔ ہندوستان کو ان کے دم سے جو فوائد حاصل ہوئے ان کی ذمہ دار وہ عالمگیر قوتیں ہیں جن کے عمل کو انگریز روک نہیں سکتا تھا۔ انگریز کی حکومت بہرحال غیر ذمہ دارانہ رہی۔ عوام اس صدیوں کی 'عادت' سے مجبور ہیں کہ وہ حکومت کو اپنے آپ سے مختلف بلکہ غیر ہمدرد ادارہ سمجھیں۔ پاکستان نے برطانیہ کا سیاسی جانشین بن کر جہاں اور بہت سی باتیں ورثہ میں پائی ہیں یہ بعد بھی ورثہ میں پایا ہے۔ یہ ایک متضاد بات معلوم ہوتی ہے لیکن عین حقیقت ہے کہ عوام جو مسلم لیگ کو اپنی واحد نمائندہ جماعت سمجھتے رہے، اب مسلم لیگ کی حکومت کو اپنی حکومت منصور نہیں کرتے۔ وہ اسے ایک 'حکومت' سمجھتے ہیں، بالکل پہلی حکومتوں جیسی ایک اور حکومت۔ ان کا خیال ہے کہ انگریز کے بعد اب ایک اور گروہ کی حکومت برسرِ اقتدار آگئی ہے (یعنی حکومت ان کی نہیں)۔

اس کی بنیادی وجہ صدیوں کی عادت ہے جس کا ہم نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس کا ازالہ کرنے کی کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔ آج ہمارے وزیرِ خزانہ فخریہ فرمارہے ہیں کہ قوم کو معلوم نہیں کہ حکومت — یعنی نصف درجن اشخاص کی جماعت — کن کن مشکلات سے دوچار رہی ہے۔ حضرت! آپ نے قوم کو یہ بتانے کی کوشش کیوں نہیں فرمائی کہ آپ کی مشکلات کیا ہیں؟ کیا جن عوام کے خون اور پسینے پر آپ کے قصرِ حکومت کی بنیادیں قائم ہیں ان کا اتنا بھی حق نہیں کہ آپ انھیں بتائیں کہ آپ کی ضروریات کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟ اور عوام آپ کے لئے کیوں مزید قربانیاں دیں؟ کیا یہ قربانی کے بکرے اتنا حق بھی نہیں رکھتے کہ انھیں معلوم ہو کہ ان کے خون کی ضرورت کیوں پڑگئی ہے؟

ضمیرِ کائنات میں پہلو بدلنے والی تبدیلیاں اب پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اب وہ وقت نہیں رہا کہ قوم کو خاموش اور گونگا مجمع سمجھ لیا جائے یا انھیں بدستور اسی وادی سکوت — اور جمود — میں رکھا جائے۔ قیامِ پاکستان سے پیشتر ہم ایسی منزل میں تھے کہ ہمیں اپنی جداگانہ حیثیت منوانے کے لئے یک زبان اور ہم آواز ہونے کی ضرورت تھی۔ اس وقت سیاسی عوامل کا تقاضا تھا کہ عوام اسی پر صاد کردیں جو کچھ قائد نے کہدیا ہے۔ اس وقت ہندو کے مقابلہ میں ہمیں یہ دکھانا تھا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ اس وقت حریتِ فکر ہمارے مفادِ ملت کے منافی تھی، کیونکہ اس کا نتیجہ تشتت ہوتا جس سے ہمارے مطالبہ کو لامحالہ نقصان پہنچتا اور ہم منزلِ پاکستان کے قریب نہ ہوسکتے۔ تقسیمِ ہند سے پیشتر کی سیاست پر نگاہ دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی سیاست صرف اس قدر تھی کہ قائدِ اعظم بطور ایک وکیل مقدمہ لڑرہے تھے اور قوم وقتاً فوقتاً یہ یاددہانی کرادیا کرتی تھی کہ ہم نے اس وکیل بلکہ اسی وکیل کو مختارنامہ دے رکھا ہے۔ چنانچہ گذشتہ دس سال میں عمومی حیثیت سے ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے "فکر" کی نوعیت یہ رہی کہ قائدِ اعظم نے ایک مقام پہ ایک رائے کا اظہار کیا اور جگہ جگہ جلسے منعقد کرکے اس فیصلہ پر صاد کردیا گیا۔ چونکہ عمومی ضرورت اس قسم کی تھی، اس لئے بقول اکبر مرحوم قومی زندگی کے آثار اخبارات تک محدود رہے اور قوم کی فکری صلاحیتیں خوابیدہ ہی رہیں۔ رائے عامہ، یعنی آئین و سیاست کا وہ حربہ کہ حکومتوں کی شکست و ریخت اسی پر منحصر ہے، ہمارے ہاں مفقود رہی۔ یہ فکری استیلا Regimentation of thought یا Power thought

ایک حد تک ناگزیر تھا کیونکہ۔ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے اس سے مقدمہ کی روئداد پر زد پڑنے کا احتمال تھا۔ یہ اتفاق و جمعیت حریف پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکے اور بالآخر اسے ہمارے مطالبہ کی بے پناہی سے کے سامنے جھکنا پڑا۔

لیکن اب حالات دگرگوں ہیں۔ قیام پاکستان تک کی جدوجہد مختلف تھی۔ اس کے حربے ناکارہ ہو چکے ہیں۔ اب محاذ بدل گیا ہے۔ مشکلات کی نوعیت اور ہے۔ وقت کے تقاضے اور ہیں۔ اب ہمیں نئے حربوں کی ضرورت ہے۔ اب چند گنتی کے افراد کو ہرگز ہرگز یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ ملت کو افیون کھلا کر سلائے رکھیں اور خود ان کی طرف سے سوچیں اور کریں۔ اب قوم ان کی موکل نہیں، نہ وہ وکیل ہیں۔ اب وہ صاحب اقتدار و اختیار اس لئے نہیں کہ کل تک وہ مسلم لیگ کے عہدے دار تھے بلکہ اس لئے کہ قوم نے نظامِ حکومت کو متشکل اور نافذ کرنے کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی ہے۔ یہ ذمہ داری اس وقت تک ان کے پاس رہے گی جب تک کہ ملت کو یہ اعتماد ہے کہ وہ اسے بطریقِ احسن بلکہ ملت کی منشا اور اس کے مفاد کے مطابق نباہ رہے ہیں۔ اب قوم ان کی محاسب ہے اور وہ قوم کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اب یہ حالت نہیں کہ وہ قوم کو رازدار نہ بنائیں اور ان ملی امور کی نگہداشت اپنا خصوصی اجارہ سمجھیں جن کی سرانجام دہی ملت نے ان کے سپرد کی ہے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے ملت اور نمائندگانِ ملت (یعنی عہدہ دارانِ حکومت) کے مابین مغایرت خلاف جمہوریت ہے اور نظام و نفاذِ نظام کے لئے مہلک۔ ہمیں افسوس ہے کہ حکومت نے اس خلا کو پُر کرنے کی مطلقاً کوشش نہیں کی۔ ۱۵ اگست کے بعد ملت پر قتل و غارت کی قیامتیں گزریں۔ لاکھوں موت کے گھاٹ اتارے گئے، لاکھوں بے خانماں ہوئے۔ چشمِ فلک نے ایسی لرزہ خیز سفاکی اس سے پہلے نہیں دیکھی ہو گی۔ اگر بغرضِ استدلال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے قائدین اس باب میں مجبور تھے تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عظیم الشان ابتلاء اور اس کے تاثرات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے حکومت نے جو کچھ کیا یا جو کچھ وہ اب کر رہی ہے یا جو اس کے آئندہ عزائم ہیں وہ کیوں صیغۂ راز میں رکھے جاتے ہیں؟ کیا اس لئے کہ استعماری قوت کی طرح کہ جس کے جانشین یہ لوگ بنے ہیں قوم کو بدستور اعتماد کے دائرے سے خارج رکھا جائے؟ اسے بدستور شودر یا اچھوت سمجھا جائے کہ اگر وہ پاس آئے تو یہ برہمن بھرشٹ ہو جائیں لیکن ان کی خدمت ان ہی لوگوں کے سپرد ہو؟

ہم اربابِ حکومت پر اس حقیقت کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہم نبضِ ملت کا احساس کر رہے ہیں، انھیں ملت کا اعتماد حاصل نہیں۔ یہ عدم اعتمادی اگر کسی صحیح ترقی یافتہ جمہوری ملک میں پائی جاتی تو حکومت کب کی شکست کھا چکی ہوتی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعض معاملاتِ حکومت کو راز میں رکھا جانا چاہئے۔ یہ درست ہے کہ ہر معاملہ میں عوام کو رازدار نہیں بنایا جا سکتا۔ لیکن جن معاملات میں رازداری سے کام لیا جاتا ہے وہاں تقاضائے وقت یہی ہوتا ہے اور ملت پر عدم اعتماد کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس وقت ملت حکومت کو 'اپنی' نہیں سمجھتی، وہ اسے بدستور اجنبی اور غیر سمجھ رہی ہے۔ حکومت نے یہ غلط فہمی رفع کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اربابِ حکومت مشینوں کی طرح پہلے سے طے شدہ آئین و ضوابط کے مطابق حکومت کر رہے ہیں اور بس۔ وہ خود اس احساس و شعور سے تہی معلوم ہوتے ہیں کہ اب حکومت 'اپنی' ہے۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک اپنے آپ کو کسی 'اور' کا ملازم متصور کرتے ہیں۔ کاش اس 'اور' سے مراد ملت ہوتی!

فسطائیت کی آمرانہ حکومت اور جمہوریت کے نظامِ جہانبانی میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ اول الذکر میں حاکم اور محکوم میں سخت مغائرت ہوتی ہے جو ان دونوں کے درمیان آہنی دیوار بن کر حائل ہوتی ہے اور محکوم "بلا شریکِ حکم" احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ لیکن ثانی الذکر میں حاکم اور محکوم کا فرق نہیں ہوتا اور محکوم اپنے آپ کو محکوم نہیں بلکہ "شریکِ حکم" سمجھتا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ قوم کو مصالحِ حکومت کا رازدار بنا کر اس کا اعتماد حاصل کر لیا جائے۔ لہٰذا اگر آپ کے دعاوئ جمہوریت مبنی بر حقیقت ہیں تو اس امر کی کوشش کیجئے کہ قوم اپنے آپ کو شریکِ حکومت کہے۔ اس میں پاکستان کے استحکام و ارتقا کا راز پوشیدہ ہے۔

حکومت اور قوم کے مابین ایک اہم رابطہ مجلسِ مقننہ کا ہے لیکن پاکستان کی مجلس دستور ساز جو اب مرکزی مقننہ کی حیثیت بھی اختیار کر گئی ہے، قیامِ پاکستان سے پیشتر منتخب ہوئی تھی۔ اس کے علیٰ حالہٖ قائم رہنے سے عوام یوں محسوس کرتے ہیں کہ یہ از غیب ان پر مسلط ہو گئی ہے اور ان کی منتخب کردہ نہیں۔ یوں بھی حالات نے انتخابی تبدیلی کو ناگزیر کر دیا ہے۔ مجلسِ مذکورہ نے حالیہ نشست میں اس کے لئے

مناسب اقدام کر بھی رہا ہے)۔ یہ مجلس "ترکیب" کے علاوہ کارروائی کے اعتبار سے بھی بے جان سی نظر آنے لگی ہے۔ ایک تو یہ اتنے طویل عرصہ کے بعد کروٹ لیتی ہے کہ اسے مردہ متصور کرنے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا اور جب اس کی نشست منعقد ہوتی ہے تو وہ اتنی مختصر اور رسمی ہوتی ہے کہ اس کی کارگزاری سے ناامیدی پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تدوینِ آئین کا معاملہ ابھی تک معلق ہے اور عوام یوں محسوس کرنے لگے ہیں کہ شاید اسے نبٹایا ہی نہیں جا سکتا یا ارکانِ مجلس اس کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اس ادارہ کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق بنا دیا جائے اور اسے زندہ اور فعال ادارہ کی حیثیت سے چلایا جائے تو حکومت اور ملت کے مابین ایک خاطر خواہ رابطے کا اجراء ہو سکتا ہے اور باہمی اعتماد کا نہایت عمدہ ذریعہ۔ اس کے علاوہ اطلاعات اور ریڈیو کے محکمے فرسودہ، دقیانوسی اور بے منزل، راہوں پر چلنے کی بجائے اگر صحیح خطوط پر کام کریں اور وہ بعجلت کے ساتھ حرکت کریں تو خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکیں گے۔ قوم بدل وجان حکومت کے ساتھ ہوگی۔ ساتھ کیا ہوگی قوم اور حکومت مرادف ہو جائیں گے۔ یہ "قران" ہو گیا تو اس کے نتائج دنیا دیکھے گی۔ یہ اس "عالمِ نو" کی تمہید ہوگی جو ابھی بعدہٗ تقدیر میں ہے۔

کی مجلس دستور ساز اور یو۔پی کی مجلس مقننہ میں لیگ پارٹی کے وجود کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد یو۔پی، بہار، سی۔پی، آسام اور مغربی بنگال میں لیگ کے سرکردہ اکابرین نے صاف طور پر اعلانات کر دیئے ہیں کہ ہندوستان میں لیگ کو باقی نہیں رکھنا چاہیئے۔

صرف اسی قدر نہیں کہ ہندوستان سے لیگ کے وجود کو ختم کر دیا، بلکہ (مسلمان چونکہ جذباتی ہونے کی وجہ سے متشدد (Extremist) واقع ہوا ہے اس لئے وہ ہمیشہ افراط اور تفریط کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس لئے) حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ یو۔پی اسمبلی میں یہ مسئلہ زیرِ غور تھا کہ لوکل باڈیز میں انتخابِ نیابت کی کیا شکل ہو۔ اس پر (ابھی کل تک) لیگ کے مشہور کارکن (اور اب) جنتا پارٹی کے لیڈر۔ مسٹر لاری نے کہا کہ ہم جداگانہ انتخاب قطعاً نہیں چاہتے کیونکہ اس زمانۂ جمہوریت میں اس قسم کا فرقہ دارانہ امتیاز سخت مضر ہے۔ اس لئے جو شخص کسی فرقہ دارانہ جماعت کے ٹکٹ پر بطور امیدوار کھڑا ہو، اس کی درخواستِ انتخاب کو ناجائز قرار دیدینا چاہیئے۔ اس کے جواب میں وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ مسٹر کھیر نے کہا کہ

> میں حزبِ مخالف کے لیڈر (مسٹر لاری) سے متفق ہوں کہ جداگانہ انتخاب نہیں ہونا چاہیئے لیکن گذشتہ دس سال سے ملک میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں جن کے پیشِ نظر حکومت مجبور ہے کہ جداگانہ مخصوص نشستوں کو (سردست) قائم رکھا جائے (ہندوستان ٹائمز ۲۳؍۳)

یعنی۔ از باغباں شد است کہ صیاد آں نکرد

یہ تھے وہ حالات جن میں، مدراس میں لیگ کا جلسہ ہوا۔ اس لئے اگر اس میں ۱۴۷ میں سے صرف ۳۲ اراکین نے شمولیت کی تو اس پر کسی قسم کا تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ بایں ہمہ ہم ان حضرات کو جنہوں نے اس اجلاس میں شرکت کی مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں کہ ایسے حوصلہ شکن اور نامساعد حالات میں انہوں نے لیگ کے وجود کو برقرار رکھنے کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ۔

وہ ملک میں امن وسلامتی کے قیام کے لئے تمام دوسری جماعتوں کے ساتھ تعاون کریں۔

یہ نہایت نیک مشورہ ہے۔ ہم شروع ہی سے عرض کرتے چلے آرہے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے صحیح راہ عمل یہی ہے کہ وہ اپنے جداگانہ ملی تشخص کو برقرار رکھیں اور امور فلاح عامہ میں وہاں کے ارباب عمل سے پورا پورا تعاون کریں۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ ہمارے اس مشورہ کو درخور اعتنا سمجھا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں (اور جیسا کہ اس سے پہلے ہم بالوضاحت لکھ چکے ہیں) ہندوستان کے مسلمانوں پر جو یاس وقنوطیت اور خود شکستگی اور مرعوبیت چھا گئی ہے اس کے ذمہ دار، ان سے زیادہ، خود ہم پاکستان کے مسلمان، ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد، ہم نے اپنے ان بھائیوں سے ایسی بے رخی اور بے اعتنائی کا ثبوت دیا ہے کہ جس کے تصور سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ خدا کرے کہ پاکستان لیگ کی تنظیم نو کے بعد ہم اس قابل ہو جائیں کہ مسلمانان ہند کے معاملہ میں ہم نے جس مجرمانہ تغافل کا ثبوت دیا ہے اس کی تلافی کر سکیں۔ ہم مسلمانان ہند سے گذارش کریں گے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہاں حالات سخت صبر آزما اور ہمت شکن ہیں۔ لیکن اس کے باوجود، اگر وہ اس ابتلاء و آزمائش میں پورے اتر آئے تو ان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیگا۔ یہ مصیبت چند روزہ ہے وہ استقامت اور صلوٰۃ رجعیت الی اللہ کی بے پناہ قوتوں سے اس کا مقابلہ کریں۔ کامیابی انشاءاللہ ان ہی کے ساتھ ہوگی۔ یہ صرف چند دن کی بات ہے اس کے بعد وہ دیکھیں گے کہ

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار — نگہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک — بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

(واشرقت الارض بنور ربھا)

---

[۱] اس موضوع پر آئندہ اشاعت میں مفصل گفتگو کی جائے گی۔

مسئلہ فلسطین مسلمانانِ عالم کے لئے جسقدر وجۂ سوہانِ روح بن رہا ہے اور جس طرح یورپ کی قوتیں مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہی ہیں، وہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔ اگرچہ، جہانتک اس قضیہ سے متعلق معلومات کا تعلق ہے ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہم میں سے بہت کم ہیں جو اس باب میں پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ اس مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہمارا ارادہ ہے کہ اس سادہ اور پُرخم مسئلہ کے پس منظر کو قارئین طلوع اسلام کے سامنے اسی وضاحت اور جامعیت سے پیش کر دیا جائے جس انداز سے تقسیم ہند کے آئینی پہلو کو طلوعِ اسلام کی دو اشاعتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے لئے فرصت درکار ہے۔ سردست ہمارے سامنے امریکہ کا وہ فیصلہ ہے جس کی رو سے تقسیم فلسطین کے سوال پر اپنی تائید اٹھا لینے کا اعلان کیا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مئی ۱۹۴۷ء میں برطانیہ کے ایما پر، انجمن اقوام متحدہ نے فلسطین کے مسئلہ کو ایک تحقیقاتی کمیشن کے سپرد کیا تھا جس کی رپورٹ پر حفاظتی کونسل نے تقسیم فلسطین کی سفارش کی تھی۔ تقسیم فلسطین کے فیصلہ سے مسلمانان عالم کے قلب درد آگیں میں کرب و الم اور غم و غصّہ کی جو لہر متموج ہوئی اس کا مشاہدہ وہ اضطراب انگیز ہیجان ہے جس نے مشرق و مغرب کی فضائے سیاست میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ امریکہ کا یہ اعلان، کچھ وقت کے لئے اس مرتعش فضا میں سکون پیدا کر دیگا۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دینا چاہیئے کہ یہ فیصلہ نہ تو اس غم و غصّہ کا نتیجہ ہے جس کا مظاہرہ مسلمانوں کی طرف سے ہوا اور نہ ہی اس سے اصل مسئلہ کا کوئی حل پیدا ہو جاتا ہے۔ اقوام مغرب ہم مشرق والوں کے مقدرات کے فیصلے اپنے اپنے اغراض و مصالح کے پیش نظر کرتی ہیں۔ گذشتہ جنگ عالمگیر کے میچ میں تین قوتیں (روس۔ امریکہ۔ برطانیہ) (Semi Final) میں آئی تھیں۔ اب فائنل میچ کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور امریکہ اور روس کی مناقشت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ معلوم کس وقت یہ آتش فشاں پھٹ جائے۔ امریکہ میں انتخابی معرکہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں جس میں ٹرومین کے مقابل میں ہنری والس، روس کی حمایت میں اپنی قوت بڑھائے جا رہا ہے۔ اندریں حالات، ٹرومین کے لئے یہی قرین مصلحت تھا کہ وہ مشرق وسطی

میں حالات کو اپنے لئے اس قدر نامساعد ہونے دے۔ فلہذا تقسیم فلسطین کی تائید کے واپس لینے کا فیصلہ۔

لیکن اس شر میں ایک خیر کا پہلو بھی ہے کہ ان تھپیڑوں سے مسلمان کچھ کچھ بیدار ضرور ہو چلا ہے اور اس نے اس حقیقت کو ایک بار پھر محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ اس کی زندگی کا راز باہمی ائتلاف و اجتماع میں ہے۔ تشتت و انتشار میں نہیں۔ چنانچہ عرب لیگ کی تشکیل اور اب محمد پاشا کی تجویز کہ انجمن اقوام متحدہ میں ایک اسلامی بلاک قائم کیا جائے اسی احساس کے مظاہر ہیں۔ اگر اس قسم کے ہچکولوں سے اتحاد اسلامی کیلئے سطح ہموار ہو جائے تو یہ سودا کچھ مہنگا نہیں۔ خدا کرے کہ اقوام مغرب کے یہ تھپیڑے ہمیں سیلی استاد بن کر لگیں اور ہم اس حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت دیکھ سکیں کہ۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

چینی کی بجائے
او۔کے۔ پوڈر استعمال کریں
یہ جدید ترین سائنٹیفک طریقہ پر تیار کیا گیا ہے۔ اس کی تیاری میں وٹامنز کے استعمال کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔
ایک تولہ او۔کے پوڈر ڈیڑھ پونڈ چینی کی جگہ استعمال کی جا سکتی ہے
قیمت۔ ڈیڑھ تولہ والا بکس۔ ایک روپیہ۔ پانچ تولہ۔ تین روپیہ۔ بیس تولہ دس روپئے۔
ہر شہر میں ایجنٹوں کی ضرورت ہے
سول ایجنٹ: امپیریل ٹریڈنگ کمپنی نمبر ۲۵ گارڈن روڈ۔ صدر۔ کراچی